امام احمد رضا

عقل و دانش کی عدالت میں

از محمد اسماعیل احمد بدایونی

اسلامک ریسرچ سوسائٹی کراچی

پہلا مقدمہ

جج ⁂ دانشوروں، اہلِ علم، اہلِ عدل اور عقل و فہم کے حامل، عصبیت سے پاک، اسلام کے مخلص لوگ۔

وکیلِ استغاثہ ⁂ مخالفینِ اہلِ سنّت۔

وکیلِ صفائی ⁂ اہلِ حق۔

استغاثہ ⁂ **مولانا احمد رضا انگریزوں کے دوست اور ایجنٹ تھے۔**

وکیلِ استغاثہ: تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ ہر دور میں حق و باطل کی جنگ ہوتی رہی۔ اہلِ حق' دارِ وفا پر شجاعتوں کی داستان رقم کرتے رہے تو اہلِ باطل مراعات کے حصول اور جاہ و حشمت کیلئے باطل کے تلوے چاٹتے رہے اور قوم کی غیرت و حمیت کا سودا کرتے رہے۔۔۔ قوم لٹتی رہی۔۔۔ خون بہتا رہا۔۔۔ لیکن یہ دولت و ثروت کے حصول کیلئے گونگے ہو گئے، ان کے کان بہرے ہو گئے، ان کی آنکھیں اندھی ہو گئیں اور تو اور ان کے دماغ معطل اور ان کی فکریں صلب ہو گئیں۔

جنابِ جج صاحب! انگریز نے جب برصغیر میں قدم رکھا تو اس نے اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑائی اور اسے اپنے مطلب کیلئے میر جعفر و میر صادق جیسے ننگِ دین اور ننگِ وطن ملے تو فکرِ مسلم پر شب خون کیلئے ان کی نگاہ مولانا احمد رضا خاں پر پڑی اور مولانا نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اپنے بیرونی آقاؤں کے اشارۂ ابرو پر قربان کر دیں۔ خود بھی تاعمر انگریزوں کے وفادار رہے اور اپنے مریدوں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہے اور ہمیشہ مسلمانوں کی راہ سے جدا راہ چلے، خواہ تحریکِ خلافت ہو یا تحریکِ ترکِ موالات' انہوں نے ہمیشہ انگریزوں کا ساتھ دیا۔

وکیلِ صفائی: (وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے)

جنابِ محترم جج صاحب! اگر الفاظ کا جادو جگانا کوئی فن ہے تو میں وکیلِ استغاثہ کو سب سے بڑا فنکار تسلیم کرتا ہوں، لیکن یہ بات بھی انکے گوش گزار کرتا چلوں کہ الفاظ کی کاری گری سے حقائق تبدیل نہیں ہوا کرتے، تاریخ تبدیل نہیں ہوا کرتی اور وقت کی گھڑی اُلٹی نہیں چلا کرتی۔

جنابِ جج صاحب! وکیلِ استغاثہ نے جس طرح تاریخ سے روگردانی کرتے ہوئے حقائق کا منہ چڑایا ہے مَیں ان سے اتنا ہی کہوں گا، چاند کا تھوکا منہ کو آتا ہے۔

محترم جج صاحب! یہ سچ ہے کہ معرکہ حق و باطل روزِ اوّل ہی سے جاری و ساری ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ باطل ہمیشہ حق کا لبادہ اوڑھ کر حق کی مذمت کرتا رہا ہے۔

جنابِ جج صاحب! اس معزز عدالت کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ صرف دو تین مثالیں عرض کروں گا:۔

عہدِ موسوی میں فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کیا الزام نہیں لگایا کہ یہ ہماری تہذیب و ثقافت کے دشمن ہیں۔ کیا انبیائے کرام کو باطل کی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا؟

اور دور نہیں جایئے! یہ مشرکینِ مکہ ہیں اور معلمِ کائنات رحمت العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مخالفت کو انہوں نے اپنا شعار بنا رکھا ہے۔

یہ مشرکینِ مکہ کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا ہے۔ اپنے آباؤ اجداد کے دین کو ترک کر دیا ہے۔ غرض یہ کہ الزامات کی بوچھاڑ باطل کا نصب العین رہا ہے۔

لہٰذا آج کی اس معزز عدالت میں وکیلِ استغاثہ نے مولانا احمد رضا پر الزامات عائد کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کا نصب العین اور باطل کا نصب العین ایک ہی ہے۔

وکیلِ استغاثہ (جج سے مخاطب ہوتے ہوئے): محترم جج صاحب! وکیلِ صفائی الزامات کا دفاع کرنے کے بجائے الزامات عائد کر رہے ہیں کہ ہمارا اور باطل کا نصب العین ایک ہے تو دلائل پیش کریں' نہ کہ صرف الزامات۔

وکیلِ صفائی: پہنچی وہیں پر خاک جہاں کا خمیر تھا

جی ہاں جج صاحب! مَیں وکیلِ استغاثہ کو اسی مقام پر لانا چاہتا تھا۔ دلائل سے تو مَیں ثابت کر چکا کہ وکیلِ استغاثہ اور باطل کا نصب العین ایک ہی رہا ہے لیکن وکیل (استغاثہ) صاحب کی تسلی و تشفی کیلئے دوبارہ بتاتا چلوں کہ باطل ہمیشہ الزامات عائد کرتا ہے لیکن کبھی الزامات ثابت نہیں کر پاتا۔ اگر وکیلِ استغاثہ اپنے مقدمے میں سچے ہیں اور ان کا مقصد مولانا احمد رضا کی مخالفت برائے مخالفت نہیں تو اس عدالت کے سامنے دلائل پیش کریں۔

جج (مسکراتے ہوئے) وکیلِ استغاثہ سے: کیا آپ دلائل کے ذریعے مولانا احمد رضا کو انگریز دوست ثابت کر سکتے ہیں؟

وکیلِ استغاثہ: یہ اتنی سچی بات ہے کہ اس پر تو کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ وکیلِ صفائی کی تسلی کیلئے میں صرف اتنا کہوں گا کہ پھر تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کی مخالفت کیوں کی گئی؟ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں سے کچھ ساز باز تھی۔

وکیلِ صفائی: جنابِ والا! یہ سچ ہے کہ باطل کو کبھی بھی الزام لگانے کیلئے دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور جنابِ والا! عدالت میں دلائل پیش کیے جاتے ہیں، محض اندازے اور تخمینوں کے بل بوتے پر کسی پر جرم ثابت نہیں کیا جاتا۔

وکیلِ استغاثہ نے اپنے ناقص مطالعے کی روشنی میں تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترک موالات کی مخالفت پر انگریز دوستی کا فتویٰ صادر کر کے نہ صرف ملتِ اسلامیہ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی ناکام کوشش کی ہے، بلکہ بہتان طرازی کے گناہ کے بھی مرتکب ہوئے ہیں۔

محترم جج صاحب! قوم گیند نہیں ہوتی، اور ملت عطردان نہیں ہوا کرتی، جسے سیاسی مداری جب چاہیں مخالف کے کورٹ میں ڈال دیں اور جب چاہیں اپنے گھر کی زینت بنالیں۔

قیادت کیلئے جس دور اندیشی اور عاقبت اندیشی کی ضرورت ہوتی ہے، کیا وہ اس دور کے ان قائدین اور لیڈروں میں تھی جو تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترک موالات چلارہے تھے۔ جناب جج صاحب! نہیں ہرگز نہیں۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کی بھٹّی کیلئے سیاسی ایندھن بنایا جارہا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ وقت نے ثابت کیا کہ ان کانگریسی لیڈروں کا فیصلہ غلط تھا۔ بعد میں علی برادران نے مولانا کی سیاسی بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی غلطی کو تسلیم کیا۔

جناب جج صاحب! مولانا صرف انگریزوں کے دشمن نہیں تھے، وہ ہندوؤں کے بھی بیک وقت مخالف تھے، جبھی انہوں نے ترکِ موالات کے موقع پر کہا تھا کہ 'مسلمانوں کی ابھی ایک آنکھ کھلی ہے اور دوسری تاہنوز بند ہے۔'

وکیلِ صفائی: جناب والا! آج کی اس معزز عدالت میں وکیلِ استغاثہ تو کوئی ثبوت پیش نہیں کرسکے مگر اس بطلِ حریت کی انگریز دشمنی میں مَیں چند دلائل گوش گزار کرتا چلوں۔

جناب والا! جس قوم سے محبت ہوتی ہے اس کی ہر چیز سے محبت ہوتی ہے اور محبت کرنے والا اس قوم کی ہر چیز کو اپنانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

لیکن امام احمد رضا کے سینے میں انگریزوں کے خلاف ایک بپھرتا ہوا طوفان نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں:-

'اللہ اللہ! یہ قوم! یہ قوم! سراسر لوم یہ لوگ! یہ لوگ جنہیں عقل سے لاگ نہیں جنہیں جنوں کا روگ، یہ اس قابل ہوئے کہ خدا پر اعتراض کریں اور مسلمان ان کی لغویات پر کان دھریں؟ انا للہ وانا الیہ راجعون' (الصمصام علیٰ مشکک فی آیۃ علوم الارحام ص ۱۹،۲۰)

کیا دوستوں کا تذکرہ اس طرح ہوتا ہے یا اس طرح دشمنوں سے بات کی جاتی ہے۔ اس عدالت کے سامنے ایک اور دلیل پیش کرتا ہوں۔

سیّد الطاف بریلوی لکھتے ہیں:۔

'سیاسی نظریئے کے اعتبار سے حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بلاشبہ حریت پسند تھے، انگریز اور انگریزی حکومت سے دلی نفرت تھی، شمس العلماء قسم کے کسی خطاب وغیرہ کو حاصل کرنے کا ان کا یا ان کے صاحبزادگان مولانا حامد رضا خاں، مصطفٰی رضا خاں صاحب کو کبھی تصور بھی نہ ہوا والیانِ ریاست اور حکامِ وقت سے بھی قطعاً راہ و رسم نہ تھی۔' (روزنامہ جنگ کراچی ۲ جنوری ۱۹۷۹ء)

محترم جج صاحب! آج تاریخ ثابت کرچکی ہے کہ امام احمد رضا جس سیاسی بصیرت کے حامل تھے، ان کے ہم عصر سیاسی رہنماؤں کو اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہ تھا اور معزز عدالت کی خدمت میں دستاویزی ثبوت اور انگریزوں کے وفادار ایجنٹوں کی عملی تصویر کیلئے میں دو تاریخی کتب پیش کررہا ہوں جو اس ضمن میں ایک مستند تحقیقی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔

(۱) مشعلِ راہ۔ از علامہ عبد الحکیم اختر شاہ جہاں پوری

(۲) گناہِ بے گناہی۔ پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد

وکیل استغاثہ: جنابِ والا! کتنے الزام دھو سکیں گی یہ دو کتابیں۔

وکیل صفائی: جنابِ اعلیٰ یہ تو الزامات کے بودے پن پر ہے اور الزام اتنا بودہ ہے کہ وکیلِ استغاثہ تو وکیل استغاثہ' انگریزوں کے وفادار مسلمانوں کے غدار مُلّا بھی باوجود مولانا احمد رضا سے ہزار دشمنی کے کوئی ثبوت پیش نہیں کرسکے اور نہ تاقیامت پیش کرسکیں گے۔

جناب جج صاحب! آج کی اس عدالت میں ایک مفصل تحریری بیان بھی داخلِ عدالت کرنا چاہوں گا تاکہ اہلِ دانش کی اس عدالت میں ان لوگوں کا کردار بھی سامنے آسکے جنہوں نے رہبر کی قبائیں پہن کر ملتِ اسلامیہ کو جی بھر کر لوٹا اور جن کے لگائے ہوئے زخموں سے آج بھی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔

جج صاحب: اجازت ہے۔

جنگِ آزادی کی خونی داستان کا آغاز کہاں سے کروں ؟ حکمرانوں کی عیاشیوں کو دوش دوں یا غداروں کو کٹہرے میں لا کھڑا کروں، علمائے حق کی سرفروشیوں کے تابناک واقعات کو بیان کروں یا علمائے سوء کی ضلالت کی پُر فریب قبا کو چاک کروں۔ یہ خون رُلاتی داستان جب ملتِ اسلامیہ کی بیٹیاں اپنے ناموس کی حفاظت کیلئے کنوؤں میں چھلانگیں لگا رہی تھیں۔ جب ماؤں کے پھٹے آنچل آنسوؤں سے تر تھے اور آہ و فغاں سے کلیجے شق ہو رہے تھے۔ اور اُمتِ مصطفےٰ کے سپوت فرنگیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے۔

آج تاریخ کا طالبِ علم یہ سوال کرتا ہے کہ چند ہزار سپاہیوں نے تختِ دہلی کو کس طرح تاراج کر ڈالا۔ ہندستان کی سپاہ کہاں سو رہی تھی؟ کیا یہ اسی قوم کی داستان ہے جس نے پہلی صدی ہجری میں دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کے تاج اُچھالے تھے؟ کیا اسی قوم کی کتھا ہے جس نے بڑے بڑے جابروں کے تخت گرا دیئے تھے؟ کیا یہ اسی قوم کی تاریخ ہے جس نے اپنے دور کے فرعونیوں کو روند ڈالا تھا؟

وقت کرتا ہے پرورش برسوں حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

آج سے ڈیڑھ سو سال قبل جب ایک انقلاب آیا.... ایک تاریک انقلاب .... شاید اسلام کے چراغ نے جس تاریکی کا کئی صدیوں تعاقب کیا تھا، چاروں طرف سے سمٹ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں ابھر رہی تھی اور اس انتظار میں تھیں کہ خرمنِ اسلام کے محافظ کب سوئیں اور کب ہمیں ڈیرے ڈالنے کا موقع ملے۔ حقیقت یہ ہے کہ خرمنِ اسلام کے محافظ ایک مدت سے اونگھ رہے تھے اور کفر کی آگ اس لئے دبی رہی کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان مجاہدین کی داستانیں اس کیلئے پانی کے چھینٹوں کا کام دیتی رہیں۔ تن کے گوروں اور من کے کالوں کو مغلیہ سلطنت کے کھوکھلے محل بھی اس قوم کے ناقابلِ تسخیر قلعے دکھائی دیتے۔

دوستو! تاریخ کا یہ موڑ نہ تو حیرت انگیز ہے اور نہ ہی اجنبی، تاریخ کے طالب علم کا سوال اپنی جگہ بجا ہے مگر

وقت کرتا ہے پرورش برسوں حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

غداروں کی ایک فصل بہت پہلے سے پک رہی تھی اور ۱۸۵۷ء وہ معرکہ ہے جب اس پکی ہوئی فصل کو انگریزوں نے کاٹا۔

جنگِ آزادی کے اسباب

علامہ فضل حق خیر آبادی نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے درج ذیل اسباب لکھے ہیں:۔

- انگریز اپنے اقتدار کے استحکام اور دوام کیلئے تمام اہل ہندستان کو نصرانی بنانے کا عزائم رکھتے تھے۔ ان عزائم کی تکمیل کیلئے انہوں نے تمام ہندستان میں عیسائی مبلغین کو پھیلا دیا اور جدید نظام تعلیم رائج کیا۔
- وہ عوام کو مجبور اور اپنا دست نگر بنانے کیلئے ہندستان کی تمام اجناس و غلہ خرید لیتے یوں معاش کے تمام ذرائع مفقود ہو جاتے۔
- انگریزوں نے مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکا اور شریف پردہ نشین عورتوں کو پردہ سے روکا۔

(علامہ محمد فضل حق خیر آبادی۔ از: سلمہ سیہول، صفحہ ۱۹۳ مطبوعہ المتاز پبلی کیشنز لاہور)

جناب جج صاحب! ایک ایسا وقت جب انگریز مسلمانوں پر شب خون مارنے کیلئے اپنے لشکر کے بھیڑیوں کو دودھ پلا رہا تھا، وہیں ملّتِ اسلامیہ کے سینے کو داغ دار اور گھائل کرنے کیلئے غداروں کو بوٹ کی نوک بھی چٹوا رہا تھا۔ کیونکہ مکار انگریز جانتا تھا کہ جس خون سے وہ نبرد آزما ہونے جا رہا ہے، اس کے خون کا ایک ہی چھینٹا اس کی پوری فوج کو خون میں نہلا دینے کیلئے کافی ہو گا۔

اور یہی وہ وقت تھا جب علمائے اہلسنّت داستانِ وفا' اپنے لہو سے تحریر کر رہے تھے۔ اپنی آنکھوں کی قیمت پر نئے افق پر خوابِ مستقبل تعبیر کر رہے تھے۔ اور یہ وہ سمے تھا جب علمائے اہلسنّت دار و رسن سجائے مقتل کو سجا رہے تھے۔ اور یہی وہ لمحات تھے جب علمائے اہلسنّت اپنے لہو سے برصغیر کی غلامی کی تاریک رات میں چراغاں کر رہے تھے۔ وفا کی مشعلیں جلا رہے تھے۔ ظلم و ستم کی دہکتی ہوئی آتش کو اپنے خون سے بجھا رہے تھے۔ اور آزادی کیلئے صلیب و مقتل سجا رہے تھے۔

ہاں یہی تھے جنہوں نے انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکارا۔ ان کی صدائے تکبیر جب برصغیر کے طول و عرض میں گونجتی تو مکار انگریز کا کلیجہ کانپ کر رہ جاتا، ان کی تلواروں کی برق آن کی آن میں انگریزوں کی صفوں کا قلع قمع کر دیتی اور ہر طرف سے یہ صدا بلند ہوتی ؎

تم بھی جاگو کہ اُفق پر کہیں مہتاب نہیں　　تم بھی جاگو کہ اعلانِ سحر خواب نہیں

انگریز کی شکست قریب ہی تھی، حریت خورشید طلوع ہی ہوا جاتا تھا کہ پانسہ پلٹ گیا۔

غداروں کی فصل پک کر تیار ہو چکی تھی۔ لیکن یہ غدار بغداد کا ایک ابن علقمی نہ تھا اور نہ ہی اُندلس کا ابو داؤد بلکہ یہاں تو معاملہ یہ تھا کہ غداروں کی پوری فورس موجود تھی جس نے نسلاً بعد نسلِ غداری کے تمغوں کو اپنے سینوں پر سجائے رکھا اور باپ کی غدّاری کا اجر سات نسلوں تک وصول کرنے کے حقدار قرار پائے۔

جناب جج صاحب! دہلی میں مسلمانوں کے گھر اُجڑ رہے تھے، مسلمانوں کی املاک شعلوں کی نذر ہو رہی تھیں، ہندستان جنگ کا جوار بھاٹا بنا ہوا تھا، انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کو للکارنے والے علمائے اہلسنّت ہی تھے۔ اسلئے انگریزوں نے سب سے زیادہ جسمانی اور روحانی اذیتیں بھی انہی کو پہنچائیں اور ان میں نامور علماء علامہ فضل حق خیر آبادی، فضل امام خیر آبادی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ، مفتی عنایت احمد کاکوروی، منصف صدر امین، مولانا فضل رسول بدایونی، مفتی عنایت اللہ، مولانا مفتی لطیف اللہ، مفتی انعام اللہ، قاضی فیض اللہ کاشمیری، مولانا عبد الجلیل، سید احمد اللہ شاہ شہید، مولانا فیض احمد بدایونی، منشی رسول بخش کاکوروی، مولانا وہاج الدین، اس وقت کے نامور علمائے کرام میں سے تھے اور حکومت کی باگ ڈور بھی انہی کے ہاتھوں میں تھی۔ مسلمانوں کی سلطنت کی بربادی ان کیلئے ناقابلِ برداشت تھی، موقع کا انتظار تھا اور جب ۱۸۵۷ء کا وقت آیا تو سب میں پیش پیش یہی حضرات تھے۔ والیانِ ریاست میں ناقوس پھونکنے والے یہی لوگ تھے۔ یہی تھے جنہوں نے اپنے تن من دھن کی بازی لگادی۔ علامہ فضل حق خیر آبادی کو انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دینے کی ایما پر کالے پانی کی سزا سنائی گئی، جہاں آپ نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ علمائے اہلسنّت کو درختوں سے باندھ کر نشانے باندھے گئے، ان کی لاشوں کو درختوں پر لٹکایا گیا۔

اور یہ سب کچھ ملتِ اسلامیہ کے ساتھ انگریزوں کے پالتو وفاداروں کے بل بوتے پر ہوا۔ ملتِ اسلامیہ کی بیٹیوں کے سہاگ انہی غداروں کی ایما پر لٹے۔ قوم کی بیٹیوں کی عفت و عصمت کو بھی تاراج ان علمائے سوء نے کیا۔

یہ علمائے سوء کون تھے؟ ان کی تاریخ اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ ان کی تاریخ انہی کی زبانی ملاحظہ کیجئے:۔

جناب جج صاحب! یہ عین وہی زمانہ تھا جب علامہ فضل حق خیر آبادی کے فتویٰ جہاد پر عمل درآمد شروع ہو چکا تھا۔ انگریز کے قدم اُکھڑ چکے تھے اور انگریز فرار ہونے کیلئے پر تول رہا تھا۔ عین اسی زمانے میں انگریزوں کے دست راست سید احمد بریلوی اور اسماعیل دہلوی 'مسلمانوں کے خلاف جہاد کر کے انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے تھے اور ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ کسی طرح درست نہیں۔

سید احمد بریلوی کے معتقد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں، یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کیلئے تشریف لے جارہے تھے تو کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں سے جہاد کرنے کو کیوں جاتے ہیں؟ انگریز جو اس ملک پر حاکم اور دین اسلام سے کیا منکر نہیں ہے؟ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ملک ہندستان لے لو یہاں لاکھوں آدمی آپ کے شریک و مدد گار ہو جائیں گے، کیوں کہ سیکڑوں کوس سفر کر کے، سکھوں کے ملک سے پار ہو کر افغانستان میں جانا اور وہاں برسوں رہ کر سکھوں سے لڑنا، یہ ایک ایسا امر محال ہے جس کو ہم لوگ نہیں کر سکتے۔

سید صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی انگریزوں اور سکھوں کا ملک لوٹ لینا ہمارا مقصد ہے۔ بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ فرائضِ منصبی ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکاتِ مستوجبِ جہاد سے باز آجائیں تو ہم کو ان سے لڑنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اور انگریزی سرکار گو منکر اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کوئی ظلم و تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرائض مذہبی اور عبادت لازمی سے روکتی ہے۔ ہم ان کے ملک میں اعلانیہ وعظ کہتے ہیں اور ترویج مذہب کرتے ہیں۔ وہ کبھی مانع و مزاحم نہیں ہوتی، بلکہ اگر ہم پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اس کو سزا دینے کو تیار ہے۔ ہمارا اصل کام اشاعتِ توحیدِ الٰہی اور احیائے سنن سید المرسلین ہے۔ سو ہم بلا روک ٹوک اس ملک میں کرتے ہیں۔ پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور اصولِ مذہب کے خلاف بلاوجہ طرفین کا خون گرادیں۔ (محمد جعفر تھانیسری، حیاتِ سید احمد شہید، صفحہ ۱۷۱، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء)

انگریزوں کے ہاتھ کس طرح مضبوط کئے سید احمد نے، اس کو بیان کرتے ہوئے تھانیسری صاحب لکھتے ہیں: ۔

اس سوانح اور مکتوبات کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب کا انگریزی سرکار سے جہاد کرنے کا ہرگز ارادہ نہ تھا وہ اس آزاد علمداری کو اپنی ہی علمداری سمجھتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ اگر انگریزی سرکار اس وقت سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندستان سے سید صاحب کو کچھ مدد نہ پہنچتی مگر سرکار انگریز دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔ (محمد جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید صفحہ ۱۷۱ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء)

مولوی منظور احمد نعمانی لکھتے ہیں، مشہور یہ ہے کہ آپ (سید صاحب اینڈ کمپنی) نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں ان کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی۔ (ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ شہید نمبر ۱۳۵۵ھ صفحہ ۷۶)

عزیزانِ گرامی! یہ صرف ایک چہرہ نہیں بلکہ ایک پورا ٹولہ ہے، جنہوں نے عبائیں پہن کر قوم کو بھڑکتی ہوئی آتش میں دھکیل دیا۔ برصغیر میں وہابیت (انگریزوں کا خود کاشتہ پودا) کے سرخیل مولوی اسمٰعیل دہلوی انگریزوں کی حمایت میں یوں بیان دیتے ہیں۔

مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں:۔

کلکتہ میں جب مولانا اسمٰعیل صاحب نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا ہے اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی تو ایک شخص نے دریافت کیا، آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے جواب دیا، ان پر جہاد کسی طرح واجب نہیں ہے ایک تو ان کی رعیت ہیں، دوسرے ہمارے مذہبی ارکان ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح کی آزادی ہے بلکہ اگر ان پر کوئی (مسلم یا غیر مسلم) حملہ آور ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔ (حیرت دہلوی، حیاتِ طیبہ، صفحہ ۳۶۴، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء)

انگریزوں کو خود بھی ان پالتو وفاداروں سے اتنی اُمید نہ ہو گی۔ شاہ سے بڑھ کر شاہ کی وفاداری کی مثال ان پالتو وفاداروں سے بڑھ کر کہیں نہیں ملے گی۔

جنابِ جج صاحب! 150 سال کو اگرچہ کافی عرصہ گزر چکا ہے مگر ابھی بھی غور کریں تو شکستہ آنچلوں سے آنسو خشک نہیں ہوئے، عفت و عصمت کے نگینوں کو پہنچنے والی ٹھیس آج بھی ملتِ اسلامیہ کے کلیجوں کو سوختہ کر رہی ہے۔

ملّتِ وہابیہ کے سرخیل اسماعیل دہلوی کی اپنی انگریز گورنمنٹ نے ملت اسلامیہ کو کس طرح جھنجوڑا، درندگی کے کیسے نقوش چھوڑے، تاریخ کے اوراق اس کی شہادت دے رہے ہیں۔

میاں محمد افضل لکھتے ہیں:۔

انقلابی جدوجہد کے بعد گوروں نے شاہی خاندان، مسلمان عمائدین، علماء، امراء اور عامۃ المسلمین پر مظالم کے جو پہاڑ توڑے انہیں دیکھتے ہوئے ابتلا، چنگیز، ہلاکو، تیمور اور نادر شاہ رحم دل قصاب معلوم ہوتے تھے، جو اپنے مذبوح کو زیادہ تڑپاتے نہ تھے۔ انگریزوں کے اپنے مورخوں نے تسلیم کیا ہے کہ جذبہ انتقام میں وہ بہیمیت کی حد تک چلے گئے تھے۔ (سقوطِ بغداد سے سقوطِ ڈھاکہ تک، صفحہ ۳۶۸، مطبوعہ الفیصل لاہور ۲۰۰۳ء)

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں نے شہر دہلی کو جس طرح برباد کیا اس کو بیان کرتے ہوئے قلم کانپتا ہے۔ بقول شاعر ؎

ذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں، فتح دہلی کے بعد شہر پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً جو قیامت گزری اس کی سرسری کیفیت بھی پیش کرنا کم از کم اتنا درد انگیز اور زہرہ گداز ضرور ہے جیسا کہ دل کو پہلو سے نکال کر دہکتے ہوئے انگاروں پر ڈال دیا جائے۔ اگر کسی شخص میں اتنی ہمت ہو کہ قلم کا کام برقِ تپاں سے لے سکے اور سیاہی کی جگہ خونِ جگر استعمال کرے تو ممکن ہے وہ اس آتش کدہ ظلم و تعدی کی دھندلی سی تصویر تیار کرے جو ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء دہلی میں انگریزوں نے بھڑکایا اور مہینوں تک شہر کا سرمایہ جان و مال و آبرو خس و خاشاک کی طرح جل کر خاکستر بنتا رہا۔ شہر دہلی نے صدیوں تک یگانہ جاہ و جلال کی بہاریں دیکھیں اور آتش و خون کے طوفانوں میں بھی غوطے کھائے، نادر و تیمور کی خوں ریزیوں کے بارے میں عام تاثر کیا ہے؟ یہ کہ ان بے درد فاتحین نے جو دورِ وحشت کی یادگار تھے نمائشِ اقتدار کے جنون میں انسانی خون کے دریا تاریخ کے صفحات پر بہا دیئے لیکن انگریز نے فتح کے بعد جو کچھ کیا، اس کیلئے تیمور و نادر کی مثالیں پیش کرنا بالکل لاحاصل و بے سود ہے۔ اس لئے کہ نہ ویسا خونچکاں مرقع دہلی کے آسمان نے پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ اس کے بعد نظر آیا۔ اگر خاکِ دہلی کے ذرّوں کو قدرت تھوڑی دیر کیلئے.... تو شاید یہ داستان سنائی جا سکے۔
(سقوطِ بغداد سے سقوطِ ڈھاکہ تک، صفحہ ۳۷۵ مطبوعہ الفیصل لاہور ۲۰۰۳ء)

سید کمال الدین حیدر 'قیصر التواریخ' میں لکھتے ہیں، ستائیس ہزار اہل اسلام نے پھانسی پائی، سات دن برابر قتل عام رہا، اس کا حساب نہیں۔ اپنے نزدیک گویا نسلِ تیمور کو نہ رکھا، مٹا دیا، بچوں تک کو مار ڈالا، عورت سے جو سلوک کیا بیان سے باہر ہے، جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔ (قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۴۵۴)

علامہ عبد الحکیم اختر شاہ جہاں۔ پوری لکھتے ہیں، عبادت گاہیں ہر مذہب و ملت کے نزدیک قابلِ احترام ہیں اور مساجد تو پھر مساجد ہیں لیکن انگریزوں نے اور اخلاقی ضابطوں کو مدنظر رکھا اور نہ ہی اپنے عیسائی ہونے کا لحاظ کیا۔ مسلم کشی کے جذبے نے انہیں اتنا اندھا کر دیا تھا کہ دہلی کی مشہور و معروف جامع مسجد کو سکھ فوج کا ہیڈ کوارٹر مقرر کر دیا گیا تھا۔ (مشعلِ راہ، صفحہ ۱۰۸)

عزیزانِ گرامی! انگریز مظالم کے چند حوالے آپ نے ملاحظہ کئے جن سے اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی انگریزوں سے جہاد واجب قرار نہیں دیتے بلکہ وفاداری کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں، بلکہ اگر ان پر کوئی (مسلم یا غیر مسلم) حملہ آور ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔ (حیرت دہلوی، حیات طیبہ صفحہ ۳۶۴ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء)

انگریزوں سے وفاداری ملتِ اسلامیہ سے غداری ہی کے مترادف ہے۔ آیئے چند اور ایمان فروشوں کا حال ملاحظہ کیجئے۔

سرسید احمد خان کو قوم کا ہیرو بنا کر کے پیش کرنے کی گھناؤنی سازش رچائی گئی۔ یہ کون تھے؟ اور کیا تھے؟

مولوی عبدالحق حقانی دہلوی سرسید کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں، اس کنبے میں ایک شخص سید احمد..... (مشعلِ راہ، صفحہ ۴۴)

الطاف حسین' سرسید احمد خان کے بارے میں لکھتے ہیں، جو شخص........ مقرر کی۔ (مشعلِ راہ، صفحہ ۴۴)

سرسید احمد خان کی انگریزوں سے وفاداری کے مذکورہ بالا اقتباسات من وعن پیش کر دیے اور مندرجہ بالا اقتباسات بلا تبصرہ عام آدمی کے ذہن کو حقیقت کے بند دریچوں تک لے جاسکتے ہیں۔

سرسید احمد خان قوم کے محسن کے روپ میں قوم کے سامنے پیش کیے گئے۔ انگریزی تعلیم تو محض بہانہ تھی، اس بہانے انگریزوں نے مسلم قوم کو اپنا ذہنی غلام بنالیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں، کچھ اوپر سو برس ہوئے ہندستان میں انگریزی حکومت آئی اور جدید علوم وفنون کو اپنے ساتھ لائی، اسکول بنائے، کالج قائم کیے، تربیت گاہ (ہاسٹل) واقامت گاہ (بورڈنگ ہاؤس) کی بنیاد ڈالی، وظیفے دیئے، ملازمتوں کا دروازہ کھولا، سررشتہ تعلیم کی رسی دراز کی، یہ سب کچھ ہوا لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ تعلیم کا نظام اور اس کا طرز وطریق ہی ایسا ناقص تھا کہ تعلیم یافتہ گروہ نہ ذہنیات ہی میں ترقی کرسکا نہ دماغ ہی آراستہ ہوئے، نہ عملی طریق پر ملک کی ثروت بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ ایجاد واختراع ہی کی جانب توجہ پیدا ہوئی۔ اس تمام تعلیمی تگ ودو اور غوغاے علم کا نتیجہ صرف اسی قدر نکلا کہ سرکاری دفتروں میں محرری نظامت کیلئے کم معاوضہ پر فرنگی کارکن نہیں مل سکتے تھے، ہندستانیوں کو انگریزی زبان میں بہرہ نہ تھا، انگریزی افسر ہندستانی محرروں کے حاجت مند بھی تھے اور ان کے ہاتھوں زحمت بھی اُٹھاتے تھے۔ پس سرکاری یونیورسٹیوں نے یہ زحمت رفع کردی۔ کلرکی کیلئے اس تعلیمی ترقی کے دور میں ہر قسم کے ہندستانی گریجویٹ ملنے لگے، جن کی زندگی کا ماحصل یہی ہوتا ہے کہ کمائیں اور کھائیں اور گورنمنٹ کی غلامی میں عمریں گزاریں۔ (ابوالکلام آزاد کے علمی شہ پارے، صفحہ ۳۳۸، مطبوعہ دارالاشاعت ۲۰۰۲ء)

علامہ اقبال نے اس تعلیمی نظام کو اپنی بصیرت افروز آنکھ سے بہت پہلے ہی دیکھ لیا تھا ؎

دیکھیے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک — شیشہ دیں کے عوض جام و سبو لیتا ہے
ہے مداوائے جنوں نشترِ تعلیمِ جدید — مرا سرجن رگِ ملت سے لہو لیتا ہے

اور کبھی اس طرح اس کے نتائج کو بیان کرتے ہیں۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر — لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

جناب جج صاحب! نہ جانے کتنے چہرے نقابوں میں چھپے رہے، غداری قباؤں اور عماموں کے پیچوں میں چھپی رہی اور آستین کے سانپ بن کر قوم کو ڈستے رہے۔ انہی میں ایک انگریزوں کے لقب یافتہ شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی بھی تھے:

شبلی نعمانی رقم طراز ہیں، مَیں (شبلی) مدت العمر کبھی انگریز کا بدخواہ نہیں رہا ہوں۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان یگانگت بڑھے اور ایک دوسرے کی طرف سے (یعنی ہندستان کے رہنے والوں اور انگریزوں کی طرف سے) جو غلط فہمیاں مدت دراز سے چلی آرہی ہیں، دُور ہوں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۸ء میں مَیں نے الندوہ میں ایک مستقل مضمون کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہباً فرض ہے۔ (محمد اکرم شیخ، شبلی نامہ صفحہ ۲۴۵)

یہ تھی شبلی نعمانی کی انگریزوں سے وفاداری شبلی نعمانی کی زبانی۔

ان ہی وفاداروں میں ایک نام الطاف حسین حالی کا بھی ہے جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انگریزوں کی حمایت کی۔ قوم کی بدقسمتی کہ جو انگریزوں کے وفادار رہے ایک سازش کے تحت انہیں ہی قوم کا ہیرو بنا کر پیش کیا گیا تاکہ نئی نسل جب شعور کی منزلوں پر قدم رکھے تو ذہنی غلامی کی بیڑیاں انہیں ہمیشہ انگریزوں کا غلام رکھے اور ایسا ہی ہوا۔

انگریزوں کے صف اوّل کے وفادار دوستوں میں ایک نام ہے مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب کا ہے۔ جنہوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت امداد اللہ مہاجر مکی کی تصنیف لطیف 'فیصلہ ہفت مسئلہ' کو اپنے شاگرد خواجہ حسن نظامی کو جلانے کا حکم دیا اور نئے نظریات کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں میں انتشار و افتراق کی نئی فصل بوئی۔

خود فرماتے ہیں، مَیں (رشید احمد گنگوہی) حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بیکانہ ہو گا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے، اسے اختیار ہے جو چاہے کرے۔ (عاشق الٰہی میرٹھی، تذکرۃ الرشید، جلد اوّل صفحہ ۸۰)

چلیئے جان چھوٹی شرک و بدعت کے مسئلہ سے انگریز سرکار کے تخت پر عقیدہ و ایمان کی آتما چڑھا دی اور اللہ کے بجائے انگریز کو مالک قرار دے دیا۔

انگریزوں سے وفاداریوں کی داستانیں بہت طویل ہیں قوم سے غدار اور انگریزوں سے وفاداری کی ایک اور داستان ملاحظہ فرمایئے:۔

یہ ہیں مولانا اشرف علی تھانوی صاحب! قوم کے اتحاد و اتفاق کے قاتل، انتشار و افتراق کے نقیب شبیر احمد عثمانی کہتے ہیں، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ہمارے اور آپ کے مسلم بزرگ و پیشوا تھے۔ ان کے متعلق بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ان کو چھ سو روپیہ ماہوار حکومت کی جانب سے دیئے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اس کا علم نہیں تھا کہ روپیہ حکومت دیتی ہے مگر حکومت ایسے عنوان سے دیتی تھی کہ ان کو شبہ نہ گزرتا تھا۔ اب اس طرح حکومت

مجھے یا کسی شخص کو استعمال کرلے مگر اس کو یہ علم نہ ہو کہ اسے استعمال کیا جارہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ شرعاً اس میں ماخوذ نہیں ہو سکتا۔
(طاہر احمد قاسمی، مولوی مکالمۃ الصدرین مطبوعہ لاہور صفحہ ۱۶)

مرزا غلام احمد قادیانی بھی انگریزوں کا ایسا پالتو وفادار تھا جس نے قوم کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کا مقدس فریضہ ان نام نہاد علماء سے بڑھ کر انجام دیا۔

اسلام دشمنی کے کارنامے کو یوں فخریہ انداز میں بیان کرتا ہے، مَیں نے ممانعتِ جہاد میں اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی ہو جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ (غلام احمد قادیانی۔ تریاق القلوب صفحہ ۲۵)

علامہ اقبال غلام احمد قادیانی کا محاسبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

کچھ غم نہیں جو حضرت واعظ ہیں تنگ دست — تہذیب نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
ردِّ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا — تردید حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

عزیزانِ گرامی! یہ ہر عہد میں موجود ہوتے ہیں۔ عباؤں اور قباؤں میں چھپے ہوئے نیزے قوم کی پیٹھ میں اتارنے کا ان کا وطیرہ بہت پرانا ہے۔

اس موضوع پر علامہ عبدالحکیم اختر شاہ جہانپوری نے ایک ضخیم کتاب 'مشعل راہ' لکھی۔ اہل ذوق اور حقیقت کو قریب سے دیکھنے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ (اس کتاب کو فرید بک سٹال نے '۱۸۵۷ء کے برطانوی مظالم کی داستان' کے نام سے بھی چھاپا ہے)

انگریز کے اصل ایجنٹ مولانا احمد رضا نہیں بلکہ ان کے مخالفین ہیں، جو مولانا کی ذات پر یہ بے جا الزام لگا کر اُن کی شخصیت کو داغدار کر کے مسلمانوں کو اُن سے بد ظن کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا احمد رضا انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ خطوط پر ٹکٹ چسپاں کرتے وقت وہ ملکہ برطانیا کا سر ہمیشہ اُلٹا رکھا کرتے تھے، تاکہ ملکہ کا سر نیچے رہے۔ وہ انگریز حکومت کو ہی نہیں مانتے تھے، اسلئے انھوں نے کبھی انگریز کی عدالت میں جانا گوارا نہ کیا۔ یہاں تک کہ اپنے زمانے میں وہ انگریزی لباس سے بھی نفرت کرتے تھے اور انھوں نے فتویٰ دیا تھا کہ انگریزی لباس میں نماز نہیں ہوگی۔

جج : تمام شواہد کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ مولانا احمد رضا خاں انگریزوں کے دوست یا خریدے ہوئے ایجنٹ ہر گز نہ تھے بلکہ مسلمانوں کے ہیرو اور ایک ایسی عبقری شخصیت کے مالک تھے جو ملّتِ اسلامیہ کیلئے ایک مضبوط ستون کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کی تعلیمات آج بھی ملّتِ اسلامیہ کیلئے باعثِ نجات ہیں اور ان کی کتب وغیرہ میں جیسا کہ ڈاکٹر مسعود احمد صاحب اور مولانا عبدالحکیم اختر شاہ جہاں پوری نے اپنی کتب میں لکھا (امام احمد رضا کی تحریر کردہ کتب کے حوالے سے) کہ مولانا احمد رضا خاں انگریز گورنمنٹ کے سخت خلاف اور مسلمانوں کے خیر خواہ تھے۔

عدالت برخواست ہوتی ہے۔

دوسرا مقدمہ

جج ٭ دانشوروں، اہلِ علم، اہلِ عدل اور عقل و فہم کے حامل، عصبیت سے پاک، اسلام کے مخلص لوگ۔

وکیلِ استغاثہ ٭ مخالفینِ اہلِ سنّت۔

وکیلِ صفائی ٭ اہلِ حق۔

استغاثہ ٭ مولانا احمد رضا خان بدعات کے نقیب تھے۔ نت نئی رسومات کو ایجاد کیا اور اُن کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کیا۔

وکیلِ استغاثہ: عزت مآب جج صاحب! اِلزامات کی ان گنت فہرست میں سے اگر مولانا احمد رضا خاں صاحب کو کسی الزام سے باعزت یا اعزاز کے ساتھ بری بھی کر دیا جائے تب بھی ان کے اوپر ایسے الزامات کا پلندہ موجود ہے، جس سے وہ کسی طور بری نہ ہو سکیں گے۔

انہی الزامات میں سے ایک بہت بڑا الزام ان پر یہ بھی عائد ہوتا ہے کہ انہوں نے ملّتِ اسلامیہ میں نت نئے رسم ورواج کو جنم دیا۔

وکیلِ صفائی: محترم جج صاحب! وکیلِ استغاثہ ایک کے بعد ایک الزام کو ثابت کریں، ان شاء اللہ پچھلے مقدے کی طرح یہ مقدمہ بھی محض الزامات کا پلندہ ہی ثابت ہو گا۔ وکیلِ استغاثہ ان کو بھی ثابت نہ کر سکیں گے۔

جج: کسی ایک نقطے پر بحث کی جائے۔

وکیلِ استغاثہ: جناب جج صاحب! بغیر تمہید کے عرض کروں گا کہ مولانا احمد رضا نے آج ہمارے یہاں سوئم، میت کا کھانا، چالیسویں کی دعوت ایک ایسا رُجحان پیدا کر دیا کہ غریب آدمی کیلئے جینا تو مشکل تھا ہی مرنا بھی مشکل کر دیا۔ اور اس قبیح رسم کے بانی و موجد مولانا احمد رضا ہیں۔

وکیلِ صفائی: جناب جج صاحب! لفظوں کا سہارا لے کر غریبوں کا رونا رو کر، روایتی سیاست دانوں کی طرح اور بیوہ عورت کے بین کی مانند وکیلِ استغاثہ نے محض الزام ہی لگایا، ثابت نہ کیا اور ثابت کریں بھی کیسے، مولانا نے جس طرح استعمار اور استعمار کے ایجنٹوں کے خلاف جو ایک طویل جنگ لڑی ہے، اس سے استعماری ایجنٹ بوکھلائے پھر رہے ہیں اور بغیر شواہد و ثبوت کے استغاثے دائر کرتے پھر رہے ہیں۔ اگر وکیلِ استغاثہ کے پاس دلیل ہے تو پیش کریں۔

وکیلِ استغاثہ: (بوکھلائے ہوئے انداز اور ذرا عجلت میں) جج صاحب! وکیلِ صفائی الزام کا دفاع کریں۔ ضروری نہیں کہ ہر الزام پر ثبوت ہی پیش کئے جائیں۔ اگر ایسا نہیں تو الزام کے خلاف ثابت کر دکھائیں۔

(عدالت میں وکیلِ استغاثہ کے جواب پر حاضرین کا قہقہہ)

جج (مسکراتے ہوئے وکیلِ صفائی سے): آپ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں۔

وکیلِ صفائی: جنابِ جج صاحب! وکیلِ استغاثہ تو ابھی مقدمے کی باقاعدہ کاروائی سے قبل ہی بوکھلا گئے اور تمام تعلیمی قابلیت ولیاقت اُڑن چھو ہو گئی۔ اور وہ یہ بھی بھول گئے کہ الزام لگانے والا ثبوت پیش کرتا ہے نہ کہ ملزم۔ یہ عقل و دانش کی عدالت ہے، رومیوں یا یونانیوں کا عدالتی اکھاڑا نہیں کہ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس لیکن مَیں اس کے باوجود اس الزام کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے یہ کہنا چاہوں گا (پُرجوش انداز میں)۔۔۔۔

وکیلِ استغاثہ (مداخلت کرتے ہوئے): جج صاحب! ثبوت موجود ہے۔

جج: اگر ہے تو عدالت میں پیش کیا جائے۔

وکیلِ استغاثہ: جنابِ جج صاحب! یہ کتاب (ایک کتاب جج کی طرف بڑھاتے ہوئے) ایک قابل ڈاکٹر خالد محمود کی ہے (ڈاکٹر پر زور)، جو مانچسٹر میں اسلامک اکیڈمی کے ڈائریکٹر اور پی ایچ ڈی (Ph.D) ہیں (Ph.D پر زور)۔ لکھتے ہیں، مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اپنی وفات سے دو گھنٹے سترہ منٹ قبل پُر تکلف کھانوں کی ایک فہرست تحریر فرمائی اور وصیت کی کہ اعزّہ سے بطیب خاطر ممکن ہو تو فاتحہ ہفتہ میں دو تین بار ان اشیا سے بھی کچھ بھیج دیا کریں:۔

'دودھ کا برف خانہ ساز اگر بھینس کا دودھ ہو تو، مرغ کی بریانی، مرغ پلاؤ، خواہ بکری کا ہو شامی کباب، پراٹھے اور بالائی فرنی، اُردکی پھریری دال مع ادرک ولوازم، گوشت بھری کچوریاں، سیب کا پانی، انار کا پانی (جوس) سوڈے کی بوتل، دودھ کا برف'۔

آخری وقت میں نیک لوگ توبہ واستغفار میں مشغول رہتے ہیں، ذکر وتلاوت کی فکر ہوتی ہے، آخرت کی طرف دھیان ہوتا ہے مگر خاں صاحب ہیں کہ اس وقت بھی چٹ پٹے کھانوں کی فہرست تیار فرمانے میں مصروف ہیں۔ (مطالعہٴ بریلویت ص ۲۰، ۲۱)

وکیلِ استغاثہ: ایک ڈاکٹر کے قلم سے نکلی ہوئی اس تحریر کے بعد کیا وکیلِ صفائی کو کسی اور ثبوت کی بھی ضرورت ہے۔

وکیلِ استغاثہ (زیرِ لب مسکراتے ہوئے):

؎ چراغِ علم جلاؤ بڑا اندھیرا ہے

وکیلِ صفائی: جنابِ جج صاحب! وکیلِ استغاثہ الزام کچھ لگا رہے ہیں، ثبوت کچھ پیش کر رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ وکیلِ استغاثہ ذہنی طور پر دیوالیہ ہو چکے ہیں۔

جج صاحب! وکیلِ استغاثہ نے ثبوت پیش نہیں کیا بلکہ ایک اور الزام عائد کیا ہے۔ اس سے قبل کہ مَیں ان کے اس دوسرے الزام پر بحث کروں، ان کی پہلی الزام تراشی کی دھجیاں بکھیرنا چاہوں گا۔

جنابِ جج صاحب! قوم کا درد جس طرح مولانا احمد رضا خاں کے سینے میں موجزن تھا وہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ میت کا کھانا اور سوئم کے کھانے سے متعلق وکیلِ استغاثہ اور اُن کے حواریوں نے اگر اعلیٰ حضرت کی کتب کا مطالعہ ہی کر لیا ہوتا، تو انہیں یوں الزام تراشیوں کی ضرورت پیش نہ آتی۔

جنابِ جج صاحب! یہ فتاویٰ رضویہ کی جلد چہارم ہے (صفحہ ۱۳۸، باب الجنائز) اس میں ایک سائل نے سوال کیا کہ اکثر بلادِ ہندیہ میں رسم ہے کہ میت کے روزِ وفات سے اس کے اعزّہ و اقارب و احباب کی عورات (عورتیں) اس کے یہاں جمع ہوتی ہیں، اس اہتمام کیساتھ جو شادیوں میں کیا جاتا ہے پھر کچھ دوسرے دن، اکثر تیسرے دن واپس آتی ہیں، بعض چالیسویں تک بیٹھتی ہیں۔ اس مدتِ اقامت میں عورت کے کھانے پینے، پان چھالیا کا اہتمام اہلِ میت کرتے ہیں، جس کے باعث ایک صرفِ کثیر کے زیر بار ہوتے ہیں اگر اس وقت ان کے ہاتھ خالی ہوں تو اس ضرورت سے قرض لیتے ہیں۔ یوں نہ ملے تو سودی نکلواتے ہیں، اگر نہ کریں تو مطعون و بدنام ہوتے ہیں یہ شرعاً جائز ہے کیا؟

جنابِ جج صاحب! سائل نے سوال کے آخر میں یہ معلوم کیا کہ یہ شرعاً جائز ہے کیا؟

(وکیلِ استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے)

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں، سبحان اللہ اے مسلمان، یہ پوچھتا ہے جائز ہے کیا؟ یوں پوچھ کہ ناپاک رسم کتنے قبیح اور شدید گناہوں، سخت شنیع و خرابیوں پر مشتمل ہے۔

جنابِ جج صاحب! وکیلِ استغاثہ جس رسم کا موجد مولانا احمد رضا کو ٹھہرا رہے ہیں، مولانا احمد رضا اُس رسم سے سخت بے زار ہیں اور ناپسندیدہ فرما رہے ہیں۔

جج صاحب: کیا وکیلِ استغاثہ' وکیلِ صفائی کے اس بیان اور مولانا احمد رضا پر عائد کردہ الزام پر مزید کچھ کہنا چاہیں گے۔

وکیلِ استغاثہ: جی نہیں! مگر خالد محمود صاحب کی عبارت پر وکیلِ صفائی کیا کہیں گے۔

وکیلِ صفائی: خالد محمود کے ڈاکٹر اور Ph.D ہونے پر جو غرّہ وکیلِ استغاثہ کو ہے، اتنا شیطان کو اپنے علم پر نہیں ہو گا۔

جنابِ جج صاحب! (انتہائی پُرجوش انداز میں) ڈاکٹر اور Ph.D کی ڈگری پر اتنا غرّہ۔ جنابِ والا! امام احمد رضا ملتِ اسلامیہ کی وہ عبقری شخصیت ہیں جن پر کئی لوگ Ph.D کر چکے ہیں، کئی کر رہے ہیں اور کئی لوگ کریں گے۔

جنابِ والا! خالد محمود صاحب کوئی غیر متنازعہ شخصیت نہیں بلکہ دیوبندی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے ایک متعصب شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے علمی خیانت کا جو طریقہ ایجاد کیا ہے، اس پر انہیں شیطان سے داد و تحسین مل چکی ہو گی اور ابلیس بھی انہیں گرو جی کہہ کر پکار اُٹھا ہو گا۔

محترم جج صاحب! عصبیت عقل و خرد کے چراغوں کو بجھا دیتی ہے۔ قوتِ غضبیہ پڑھے لکھے شخص کو بھی جانور سے بدتر کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر خالد محمود جو الزام ملتِ اسلامیہ کی عبقری شخصیت پر عائد کر رہے ہیں اس سے خود اُن کے اکابر کے دامن اس حد تک داغدار ہیں کہ اگر وہ اپنے دامن پر ان داغوں کو دیکھ لیتے تو شاید مولانا احمد رضا پر الزامات عائد نہ کرتے۔

وکیلِ استغاثہ (تھوڑا سا طیش میں): جج صاحب! وکیلِ صفائی عدالت کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور الزامات سے جان چھڑانے کیلئے الزامات عائد کر رہے ہیں۔

وکیلِ صفائی: جنابِ جج صاحب! عدالت کے سامنے صرف گواہ ہی اہم نہیں ہوتا، گواہ کا کردار بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ وکیلِ استغاثہ اور اُن کے موکل اور گواہ خالد اگر ملتِ اسلامیہ کی عبقری شخصیت پر الزام عائد کر کے علم و دانش کی مسندوں پر بھنگڑے ڈالنا شروع کر دیں اور قلم و قرطاس کی عصمت کو بے آبرو کر کے اُمتِ مسلمہ کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں تو ان میں اتنا حوصلہ بھی ہونا چاہیے کہ اہلِ دانش، اہلِ حق کی اس عدالت میں اپنے اکابرین کی قباؤں پر لگے ہوئے خونی دھبّوں کو بھی ملاحظہ کر سکیں۔

وکیلِ استغاثہ: چلئے (وکیلِ صفائی کی جانب دیکھتے ہوئے) اپنی جان چھڑانے کیلئے اور اعتراض کے جواب سے پہلو تہی کرتے ہوئے آپ اس عدالت میں یہ خونی دھبّے دکھا دیجئے۔

وکیلِ صفائی: (وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے)

جناب والا! وکیلِ استغاثہ آئینہ دکھانے سے پہلے ہی برا مان گئے۔ آج اس اہلِ دانش کی عادلانہ عدالت میں مَیں وکیلِ استغاثہ اور اُن کے گواہ ڈاکٹر خالد محمود کے اعتراض سے پہلو تہی نہیں کروں گا بلکہ سخت جرح کرتے ہوئے اس اعتراض کی دھجیاں بکھیرنا چاہوں گا۔ ڈاکٹر خالد محمود صاحب نے سیاق وسباق سے ہٹ کر جس طرح اُمتِ مسلمہ کی عبقری شخصیت مولانا احمد رضا پر ہرزہ سرائی کی ہے، یہ مشقِ ستم، اہلِ ستم کو بہت بھائی ہوگی۔ مگر اہلِ علم کے سینوں کو داغ دار کر گئی ہے۔

مولانا احمد رضا خاں، وصایا شریف نمبر گیارہ میں لکھتے ہیں، فاتحہ کے کھانے سے اغنیا کو کچھ نہ دیا جائے صرف فقرا کو دیں اور وہ بھی اعزاز اور خاطر داری کے ساتھ 'نہ جھڑک کر۔ غرض کوئی بات خلافِ سنّت نہ ہو۔

مزید آگے لکھتے ہیں، غرباء اور مساکین کو عمدہ اور لذیذ چیزیں کب میسر ہوتی ہیں تو وہ اشیا جو غربا کو میسر نہیں آتیں ان کے متعلق فرمایا جاتا ہے اعزا سے اگر بطیبِ خاطر ممکن ہو تو فاتحہ... اشیا... اگر روزانہ ایک چیز ہو سکے یوں کر دیا جیسے مناسب جانو مگر بطیبِ خاطر میرے کہنے پر مجبورانہ ۔۔۔ (وصایا شریف، ص ۲۴)

جج صاحب! نمبر گیارہ میں فاتحہ کا ذکر ہے کہ فاتحہ کے کھانے سے اغنیا کو کچھ نہ دیا جائے اور نمبر بارہ (۲۱) میں فاتحہ کی اشیاء کو غرباء کو دینے کا ذکر فرمایا، وہ بھی بطیبِ خاطر۔

جج صاحب! اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کر لیجئے، ہر دَور کا امام، ہر زمانے کا مجدّد، ہر عہد میں مسلمانوں کے اسلاف کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ خلقِ خدا کو وہ نوازتے رہے۔ جہاں تک اُن سے ہو سکا، مخلوقِ خدا کے کام آتے رہے۔ جب یہی کام مولانا احمد رضا نے کیا تو نہ جانے کیوں یہ عمل ڈاکٹر خالد محمود کو برا لگا اور انہوں نے سیاق وسباق سے ہٹ کر اس عبقری شخصیت کے اُجلے دامن کو داغدار کرنے کی کوشش کی۔ محترم جج صاحب! وکیلِ استغاثہ کی شدید خواہش پر مَیں وہ خونی دھبے بھی دکھا دوں، جن سے مولانا احمد رضا کا دامن تو پاک ہے مگر علمائے دیوبند کی قبائیں اس خون میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

ککڑی کی تلاش

مولوی ظہور الحسن صاحب، مولوی اشرف علی صاحب کی تصدیق کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں، خاں صاحب نے فرمایا کہ مولانا (محمد قاسم) نانوتوی جب مرضِ وفات میں مبتلاء ہوئے کہ کہیں سے ککڑی لاؤ۔ مولوی محمود الحسن صاحب فرماتے تھے کہ تمام کھیتوں میں پھرا مگر صرف ایک ککڑی چھوٹی سی ملی۔ اس کی خبر کسی ذریعہ سے لکھنؤ مولوی عبد الحئ صاحب فرنگی محلی کو ہو گئی کہ مولانا نانوتوی کا جی ککڑی کو چاہتا ہے۔ اس پر مولوی عبد الحئ صاحب نے لکھنؤ سے مولانا (نانوتوی) کی خدمت میں بذریعہ ریلوے ککڑیاں بھیجیں اور چند مرتبہ بھیجیں۔ (ارواح ثلٰثہ۔ حکایت نمبر ۲۲۴-۲۲۶۔ کتب خانہ امدادیہ سہارنپور)

سردے کیلئے بے چین

اور لیجئے یہ ہیں شیخ الاسلام دارالعلوم دیوبند مولوی حسین احمد۔ ان کے متعلق 'شیخ الاسلام نمبر' یوں رقم طراز ہے، کچھ عجیب اتفاق ہے کہ عموماً تمام مشائخ (دیوبند) اور خصوصاً مولانا محمد قاسم نے آخر وقت میں پھل کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم کیلئے لکھنؤ سے ککڑی منگائی گئی۔ حضرت حسین احمد مدنی نے بھی آخری وقت میں سردے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ اور منجانب اللہ اسلاف کی سنت پر طبیعت اس درجہ مجبور ہوئی کہ مولانا قاسم صاحب اور شاہد صاحب فاخری ملاقات کو تشریف لائے تو فرمایا کہئے کیا آج کل سردا نہیں مل سکتا؟ انہوں نے فرمایا ضرور مل جائے گا۔ (چونکہ اس سے قبل مولانا اسعد صاحب، مولانا فرید الوحیدی صاحب وغیرہ نے دہلی، سہارنپور، میرٹھ ہر جگہ تلاش کیا مگر کہیں دستیاب نہ ہوا) اس لئے حضرت نے فرمایا کہاں مل سکتا ہے؟ مولانا وحید الدین صاحب قاسمی نے عرض کی ان شاء اللہ دہلی میں مل جائیگا۔ مولانا شاہد صاحب نے عرض کیا جی ہاں! تلاش کے بعد بہت اُمید ہے کہ مل جائے گا اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ حضرت نانوتوی کیلئے لکھنؤ سے ککڑی منگائی گئی تھی تو حضرت (حسین احمد) کیلئے مولانا سجاد حسین کی معرفت کراچی سے اور مولانا حامد میاں صاحب نے لاہور سے سردا بھیجا۔ (شیخ الاسلام نمبر، ص ۱۱۴۔ کالم ۲۔۳)

مرتے وقت چندہ مانگنا

اور لیجئے! یہ آپ کے حکیم الامت مولوی اشرف علی صاحب تھانوی مرتے وقت اپنی اہلیہ کیلئے امداد مانگ رہے ہیں اور وصیت فرمارہے ہیں کہ میرے بعد بھی میرے تعلق کالحاظ غالب ہو۔ وصیت کرتا ہوں کہ بیسا آدمی مل کر اگر ایک ایک روپیہ ماہوار ان (بیوی صاحبہ) کیلئے اپنے ذمہ رکھ لیں تو اُمید ہے کہ ان کو تکلیف نہ ہو گی۔ (تنبیہاتِ وصیت، ص ۲)

وکیلِ استغاثہ: جناب جج صاحب! مولانا احمد رضا خاں صاحب کو وکیلِ صفائی کے اس مختصر بیان پر اس الزام سے بری نہیں کرسکتے۔

جج (وکیلِ استغاثہ سے): کیا آپ مزید کوئی اعتراض داخل کرنا چاہتے ہیں۔

وکیلِ استغاثہ: جی ہاں! جج صاحب۔ مَیں کچھ اور اعتراض بھی داخل کرنا چاہتا ہوں۔

جج: اجازت ہے۔

وکیلِ استغاثہ: جنابِ والا! عورت کسی بھی قوم کیلئے ایک سرمایہ ہوتی ہے۔ قوم کا ایک حساس ادارہ ہوتی ہے جس سے ملت کا مستقبل وابستہ ہوتا ہے۔ مولانا احمد رضا خاں بجائے اس کے، اس عورت کو اسلام کی تعلیمات کے مطابق چادر اور چار دیواری کا تحفظ فراہم کرتے، اسلامی تعلیمات کے مطابق اس کو تحفظ دیتے، اُسے مزارات پر حاضری دینے والی کنیز بنادیا جو اپنے بچوں کو سنبھالے گرتی پڑتی، سات جمعراتیں پوری کرنے آرہی ہے۔ مگر مولانا احمد رضا مجاور کے گھر کی چاندنی کروانے اور ملتِ اسلامیہ کے مستقبل کو تاریک کرنے اور قوم کے اس ادارے کو تباہی کی جانب مائل کرنے میں مصروفِ عمل ہیں۔

وکیلِ صفائی: (وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے): وکیلِ استغاثہ کا وہی بے سود تجسس، وہی بے کار سوال، وہی ذہنی مفلسی میں نکلا ہوا بے تکا اعتراض۔ جناب جج صاحب! وکیلِ استغاثہ اعتراض در اعتراض کے چنگل میں پھنس کر ذہنی طور پر دیوالیہ ہوچکے ہیں۔

وکیلِ استغاثہ: جناب جج صاحب! وکیلِ صفائی مجھ پر لفظوں کے تیر برسانے کے بجائے اپنے موکل کا دفاع کرنے میں یہ لفظوں کا خزانہ خرچ کردیں تو زیادہ مفید ہوگا۔

وکیلِ صفائی: جنابِ والا! میں اس عدالت میں یہ درخواست کرنا چاہوں گا کہ وکیلِ استغاثہ اس اعتراض پر عدالت کے سامنے دلیل پیش کریں۔

وکیلِ استغاثہ: جنابِ والا! بجائے اس کے کہ مَیں اس عدالت میں تحریری یا لفظی ثبوت پیش کروں، مَیں مولانا احمد رضا کے عملی پیروکاروں کو اس ثبوت کے طور پر پیش کرتا ہوں اور آپ پاک وہند کے کسی بھی شہر میں، کسی بھی قصبے میں اور کسی بھی دیہات میں تشریف لے جایئے، آپ کو یہ بریلوی حضرات، مزاروں کو چومتے، ان کی عورتیں مزارات کی زیارت اور ان کے مرد دھمال کھیلتے نظر آئیں گے۔ قوالی کی محفل میں رقص وسرود کرتے نظر آئیں گے، تعزیہ نکالنا اس قوم کا شعار ہے۔

وکیلِ صفائی: جناب والا! وکیلِ استغاثہ کی یہ دلیل اتنی بے ہودہ ہے کہ اس کو دیوار پر مار دینے کا دل چاہتا ہے۔ ان کی اس دلیل سے نہ صرف اس عدالت کا تقدس پامال ہوا بلکہ علم و دانش پر جہالت کی کیچڑ بھی اُچھالی گئی۔

جناب والا! یہودیوں کا کردار آپ کے سامنے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرعون سے نجات دی اور ابھی یہ دریائے نیل سے نکلے ہی تھے اور پانی سے ان کے پاؤں خشک بھی نہ ہونے پائے تھے کہ انہوں نے ایک قوم کو دیکھا جو کسی بت کی پرستش میں مصروفِ عمل تھی۔ تو موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہمیں بھی ایک ایسا ہی بت بنا دو۔ اور جناب جج صاحب! کیا بنی اسرائیل میں سامری نے بچھڑا نہیں بنایا اور کیا یہودیوں نے اس کی پرستش نہیں کی؟ کیا کوئی مسلمان یا اہلِ حق اس کا الزام موسیٰ علیہ السلام پر عائد کرنے کی جرأتِ فاسدہ کر سکتا ہے؟

جواب سادہ سا ہے، جی نہیں۔ مگر باوجود اس کے کہ وکیلِ استغاثہ دلیل دینے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکے ہیں۔ میں اہلِ عقل و دانش کی عدالت میں اس جھوٹے اور بے ہودہ اعتراض کی دھجیاں بکھیرنا چاہوں گا۔

جناب والا! مولانا احمد رضا خاں ہی وہ عظیم شخصیت ہیں، جنہوں نے بلادِ ہند میں ٹوٹی ہوئی چٹائی پر بیٹھ کر نہ صرف ملت کے مستقبل کو محفوظ کیا بلکہ عورت کو چادر اور چار دیواری کا تحفظ بھی عطا کیا۔ اعلیٰ حضرت سے سوال کیا گیا کہ حضور اجمیر شریف میں خواجہ کے مزار پر عورتوں کا جانا جائز ہے یا نہیں؟ تو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں، یہ نہ پوچھو کہ عورتوں کا مزارات پر جانا جائز ہے یا نہیں بلکہ یہ پوچھو کہ اس عورت پر کس قدر لعنت ہوتی ہے اللہ کی طرف سے اور کس قدر صاحبِ قبر کی جانب سے، جس وقت وہ گھر سے ارادہ کرتی ہے لعنت شروع ہو جاتی ہے اور جب تک واپس آتی ہے، ملائکہ لعنت کرتے رہتے ہیں۔ سوائے روضہ انور کے کسی مزار پر جانے کی اجازت نہیں۔ (امام احمد رضا اور ردِّ بدعات و منکرات صفحہ ۲۸۳، مطبوعہ ادارہ تحقیقاتِ امام احمد رضا بحوالہ الملفوظ حصہ دوم صفحہ ۱۰۶، ۱۰۷)

جناب والا! وکیلِ استغاثہ نے حساس لفظوں کے استعمال سے مولانا احمد رضا پر کیچڑ اچھالی تھی ان کا دامن اس سے نہ صرف پاک اور اُجلا ہے بلکہ وہ ملت کی بیٹیوں کی چادر اور چار دیواری کا تحفظ بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

وکیلِ استغاثہ نے مقدمہ کے دوران عدالتی قواعد و ضوابط کو نظر انداز کرتے ہوئے چند اور اعتراض وارد کئے تاکہ وہ اپنے سابقہ الزام کو مضبوط کر سکیں مگر کچی مٹی کی چھت کو ریت کے ستون سہارا نہیں دے سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ وکیلِ استغاثہ مولانا احمد رضا پر عائد کردہ نئے اعتراضات پر حسبِ معمول دلائل دینے سے ہچکچائیں گے۔

اگرچہ مَیں قانونی اور اخلاقی طور پر اس سے آزاد ہوں کہ اگر وکیلِ استغاثہ عائد کردہ الزامات پر دلائل نہ دیں تو مَیں اُن الزامات کا جواب نہ دوں، مگر ملّت کی اس عبقری شخصیت پر عائد کردہ جھوٹے الزامات سے قوم کے ذہنوں کو آلودہ کرنے کی سازش کے تاروپود بکھیر کر آج کی اس عدالت کو ضرور آگاہ کرنا چاہوں گا کہ مولانا احمد رضا خاں ان تمام الزامات سے پاک ہیں۔

وکیلِ استغاثہ نے جو استغاثہ جمع کرایا، وہ صرف بغض و حسد کا پلندہ ہے، اس کے علاوہ اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ مَیں اس عدالت سے درخواست کروں گا کہ وکیلِ استغاثہ کو تمام اعتراضات جمع کرانے کا حکم دیں۔

جج صاحب: کیا وکیلِ استغاثہ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

وکیلِ استغاثہ: جنابِ والا! وکیلِ صفائی کی تقریر اگرچہ میرے خلاف ہی جاتی ہے مگر میں اسے کھلے دل سے تسلیم کرتا ہوں، مگر چند اعتراضات اب بھی داخل ضرور کرانا چاہوں گا:۔

- ❖ کیا مولانا احمد رضا نے سجدۂ تعظیمی کو جائز نہیں ٹھہرایا؟ قبروں پر سجدہ، پیر کو سجدہ مولانا نے جائز نہیں ٹھہرایا۔
- ❖ قوالی سے متعلق مولانا کا موقف واضح کریں گے کیا وکیلِ صفائی؟
- ❖ ۱۰ محرم الحرام کو تعزیہ داری کی رسم کو فروغ دینے میں کیا مولانا کے کردار سے انکار کیا جا سکتا ہے؟
- ❖ (۱) بعض اہلسنّت وجماعت عشرۂ محرم میں نہ تو دن بھر روٹی پکاتے اور نہ جھاڑو دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ بعد دفن تعزیہ روٹی پکائی جائے گی۔

(۲) دس دن کپڑے نہیں اتارتے۔

(۳) ماہِ محرم میں کوئی شادی بیاہ نہیں کرتے۔ ان ایام میں سوائے امام حسن و امام حسین کے کسی کی نیاز و فاتحہ نہیں دلاتے۔ اس پر مولانا احمد رضا نے کہیں منع نہ کیا۔

- ❖ طوافِ قبر پر مولانا کا موقف کیا ہے؟

وکیلِ صفائی: رسی جل گئی مگر بل نہیں گئے۔ (زیرِ لب مسکراتے ہوئے)

جنابِ والا! وکیلِ استغاثہ نے سچائی کو تسلیم کر لیا۔ مَیں ان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ آنکھیں بند کرنے سے سورج غروب نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کی کرنیں عالم میں اُجالا کرتی رہتی ہیں۔

وکیلِ استغاثہ نے مجھ سے سجدۂ تعظیمی کے بارے میں سوال کیا کہ کیا مولانا احمد رضا نے اس کو جائز نہیں ٹھہرایا، یا اعتراض وارد کیا؟

جنابِ والا! مولانا احمد رضا نے اس مسئلے پر جو موقف اپنایا ہے، وہ درج ذیل ہے، مسلمان! اے شریعتِ مصطفوی کے تابع فرمان جان اور یقین جان کہ سجدہ حضرت عزت جلالہ کے سوا کسی کیلئے اس کے غیر کو سجدۂ عبادت تو یقیناً اجماعاً شرک مہین وکفر مبین اور سجدۂ تحیت حرام وگناہ کبیرہ بالیقین۔ (امام احمد رضا اور رڈ بدعات ومنکرات، صفحہ ۴۶۰۔ بحوالہ الزبدۃ الزکیہ لتحریم سجود التحیہ صفحہ ۵)

جنابِ والا! اس مسئلے پر الزبدۃ الذکیہ کے نام سے پورا رسالہ رقم کیا، مزید آگے فرماتے ہیں، قرآنِ عظیم نے ثابت فرمایا کہ سجدۂ تحیت ایسا سخت حرام ہے کہ مشابہ کفر ہے والعیاذ باللہ تعالیٰ، صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سجدۂ تحیت کی اجازت چاہی اس پر ارشاد ہوا، کیا تمہیں کفر کا حکم دیں۔ معلوم ہوا کہ سجدۂ تحیت ایسی قبیح چیز ہے جسے کفر سے تعبیر فرمایا۔ جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کیلئے سجدۂ تحیت کا یہ حکم ہے، پھر اوروں کا کیا ذکر؟ (ایضاً، صفحہ ۴۶۱)

عزت ماب جج صاحب! وکیلِ استغاثہ نے دوسرا الزام قوالی اور بھنگڑوں کا بھی عائد کیا۔ مولانا احمد رضا ان مزامیر اور بھنگڑوں کے بارے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں، ایسی قوالی حرام ہے۔ حاضرین سب گناہگار ہیں اور ان سب کا گناہ ایسا عرس کرنے والوں اور قوالوں پر ہے۔ اور قوالوں کا بھی گناہ اس عرس کرنے والے پر بغیر اس کے عرس کرنے والے کے ماتھے قوالوں کا گناہ جانے سے قوالوں پر سے گناہ کی کچھ کمی آئے یا اس کے اور قوالوں کے ذمہ حاضرین کا وبال پڑنے سے حاضرین کے گناہ کی کچھ تخفیف ہو۔ نہیں، بلکہ حاضرین میں ہر ایک پر اپنا پورا گناہ اور قوالوں پر اپنا گناہ الگ اور قوالوں کے برابر جدا۔ اور سب حاضرین کے برابر علیحدہ۔ وجہ یہ کہ حاضرین کو عرس کرنے والے نے بلایا یا کسی کیلئے اس گناہ کا سامان پھیلایا اور قوالوں نے انہیں سنایا، اگر وہ سامان نہ کرتا یہ ڈھول سارنگی نہ سناتے تو حاضرین اس گناہ میں کیوں پڑتے۔ اس لیے ان سب کا گناہ ان دونوں پر ہوا پھر قوالوں کے اس گناہ کا باعث وہ عرس کرنے والا ہوا وہ نہ کرتا، نہ بلاتا تو یہ کیونکر آتے بجاتے، لہٰذا قوالوں کا بھی گناہ اس بلانے والے پر ہوا۔۔۔ الخ (رڈ بدعات ومنکرات ص ۴۷۷، بحوالہ احکام شریعت ص ۲۹)

جنابِ والا! تیسرا اعتراض وکیلِ استغاثہ نے یہ داخل کیا کہ کیا ۱۰ محرم الحرام کو تعزیہ داری کی رسم کو فروغ دینے میں مولانا احمد رضا کے کردار سے انکار کیا جاسکتا ہے۔

اس پر میں کہوں گا کہ اگر وکیلِ استغاثہ اور مخالفینِ مولانا احمد رضا نے اعلیٰ حضرت کی کتابوں کا مطالعہ کر لیا ہوتا تو ان اعتراضات کی جرأت وہمت نہ کرتے اور یوں بہتان والزام تراشی کا طوق اپنے گلوں میں نہ ڈالتے۔

تعزیہ داری سے متعلق مولانا احمد رضا کے پاس سوال آیا، آپ فرماتے ہیں، وہ جاہل خطاوار مجرم ہے مگر کافر نہ کہیں گے۔ تعزیہ آتا دیکھ کر اعتراض وروگردانی کریں۔ اس کی جانب دیکھنا ہی نہ چاہیے۔ اس کی ابتدا سنا جاتا ہے کہ امیر تیمور بادشاہ دہلی کے وقت سے ہوئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب (عرفانِ شریعت حصہ اوّل صفحہ ۱۵، مطبوعہ سُنّی دارالاشاعت لائلپور)

ایک اور جگہ پر آپ سے سوال کیا گیا کہ تعزیہ داری میں لہو ولعب سمجھ کر جائے، تو کیسا ہے۔ جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں، نہیں جاہیے ناجائز کام ہے، جس طرح جان ومال سے مدد کرے، یونہی سواد بڑھا کر بھی مدد گار ہوگا۔ ناجائز بات کا تماشہ دیکھنا بھی ناجائز ہے۔ بندر نچانا حرام ہے اس کا تماشہ دیکھنا بھی حرام ہے۔ (ملفوظاتِ اعلیٰ حضرت حصہ دوم صفحہ ۱۰۰۔ ناشر مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی)

جنابِ والا! فتاویٰ رضویہ جلد ۲۱ سے ایک آخری حوالہ پیش کرنا چاہوں گا۔ مولانا احمد رضا تعزیوں کے حوالے سے لکھتے ہیں، حاشا تعزیہ ہرگز اس کی نقل نہیں، نقل ہونا درکنار بنانے والوں کو نقل کا قصد بھی نہیں، ہر جگہ نئی تراش، نئی گھڑت جسے اس اصل سے نہ کچھ علاقہ، نہ نسبت۔ پھر کسی میں پریاں، کسی میں براق، کسی میں اور بے ہودہ طمطراق۔۔ پھر کوچہ بکوچہ۔۔ دشت بدشت۔۔ اشاعتِ غم کیلئے ان کا گشت۔۔ اور اس کے گرد سینہ زنی، ماتم سازی کی شور افگنی۔۔ حرام مرثیوں سے نوحہ کنی۔ عقل و نقل سے جُٹ چھنی۔۔ کوئی ان کھپچیوں کو جھک جھک کر سلام کر رہا ہے۔۔ کوئی مشغولِ طواف، کوئی سجدہ میں گرا ہے۔۔ کوئی اس مایہ بدعات کو معاذ اللہ جلوہ گاہِ حضرت امام عالی مقام سمجھ کر اس ابرک پنّی سے مرادیں مانگتا ہے، منّتیں مانتا، عرضیاں باندھتا، حاجت روا جانتا ہے پھر باقی تماشے، باجے تاشے، مردوں عورتوں کا راتوں کو میل اور طرح طرح کے بے ہودہ کھیل۔۔ ان سب پر طرہ ہیں۔ غرض عشرۂ محرم الحرام کہ اگلی شریعتوں سے اس شریعت پاک کا نہایت بابرکت و محلِ عبادت ٹھہرا ہوا تھا، ان بے ہودہ رسموں نے جاہلانہ اور فاسقانہ میلوں کا زمانہ کر دیا، پھر وبال ابتداع کا وہ جوش ہوا کہ خیرات کو بھی بطور خیرات نہ رکھا۔ ریاء و تفاخر اعلانیہ ہوتا ہے، پھر وہ بھی یہ نہیں کہ سیدھی طرح محتاجوں کو دیں، بلکہ چھتوں پر بیٹھ کر پھینکیں گے۔۔ روٹیاں زمین پر گر رہی ہیں، رزقِ الٰہی کی بے ادبی ہوتی ہے، پیسے ریتے میں گر کر غائب ہوتے ہیں، مال کی اضاعت ہو رہی ہے، مگر نام تو ہو گیا کہ فلاں صاحب لنگر لٹا رہے ہیں۔ اب بہار عشرہ کے پھول کھلے، تاشے باجے، بجتے چلے.... طرح طرح کے کھیلوں کی دھوم، بازاری عورتوں کا

ہر طرف ہجوم.... شہوانی میلوں کی پوری رسوم.... جشن فاسقانہ یہ کچھ، اور اس کے ساتھ خیال وہ کچھ، گویا یہ ساختہ ڈھانچہ بعینہا حضرات شہدائے کرام علیہم الرضوان کے پاک جنازے ہیں۔

اے مومنو! اٹھاؤ جنازہ حسین کا گاتے ہوئے مصنوعی کربلا پہنچے۔ وہاں کچھ نوچ اُتار۔۔ باقی توڑ تاڑ دفن کر دیئے۔ یہ ہر سال اضاعتِ مال کے جرم و وبال جدا گانہ رہے۔ اللہ تعالیٰ صدقہ شہدائے کرام کربلا علیہم الرضوان والثناء کا مسلمانوں کو نیک توفیق بخشے اور بدعات سے توبہ دے۔ آمین آمین

مزید لکھتے ہیں، تعزیہ داری کہ اس طریقہ نامرضیہ کا نام ہے قطعاً بدعت و ناجائز و حرام ہے، ان خرافاتِ شیوع نے اس اصل مشروع کو بھی اب مخدور و محظور کر دیا کہ اس میں اہل بدعت سے مشابہت اور تعزیہ داری کی تہمت کا خدشہ.. اور آئندہ اپنی اولاد یا اہلِ اعتقاد کیلئے ابتلائے بدعات کا اندیشہ ہے، جو چیز ممنوع تک پہنچائے، وہ ممنوع ہے۔ (فتاویٰ رضویہ جلد ۲۱ صفحہ ۲۲۳، ۲۲۴۔ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور مئی ۲۰۰۲ء)

وکیلِ استغاثہ نے چوتھا اعتراض کچھ اس طرح سے کیا کہ

- بعض اہلسنّت وجماعت عشرۂ محرم میں نہ تو دن بھر روٹی پکاتے اور نہ جھاڑو دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بعد دفن تعزیہ روٹی پکائی جائے گی۔
- دس دن کپڑے نہیں اُتارتے۔
- ماہِ محرم میں کوئی شادی بیاہ نہیں کرتے۔ ان ایام میں سوائے امام حسن وامام حسین کے کسی کی نیاز و فاتحہ نہیں دلاتے۔

اس پر مولانا احمد رضا نے کہیں منع نہ کیا۔

جنابِ والا! دُکھتی آنکھوں کو سورج برا لگتا ہے، آنکھیں بند کر کے روشنی کو اندھیرے سے تعبیر کرنا باطل کا ایک پرزور ہتھکنڈہ ہے۔ مَیں پوچھنا چاہوں گا وکیلِ استغاثہ سے، کیا انہوں نے مولانا کی تمام کتب کا مطالعہ کرلیا ہے جو وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ 'مولانا احمد رضا نے کہیں منع نہ کیا'۔

جنابِ والا! اگر علم و دانش کی عدالتوں میں فکر و بصیرت کا لہو یوں ہی چھلکے گا تو مستقبل کا مؤرخ کیا کہہ کر پکارے گا۔ جنابِ والا! اگر تحقیق کے بغیر الزام تراشیوں کا یہ گھناؤنا کاروبار یونہی چلتا رہا تو ملّتِ اسلامیہ کے گلشن میں پھولوں کے بجائے ببول اُگنے لگیں گے۔

اے عقل و دانش کی مسندوں پر تشریف فرما ہونے والے بزرگو! وکیلِ استغاثہ کے اعتراض کو ایک سائل نے بہت پہلے ایسے ہی پوچھا تھا، تو امام نے جواب دیا تھا کہ پہلی تین باتیں سوگ ہیں اور سوگ حرام ہے اور چوتھی بات جہالت ہے۔ ہر مہینے میں، ہر تاریخ میں، ہر ولی کی نیاز اور ہر مسلمان کی فاتحہ ہو سکتی ہے۔ (احکامِ شریعت حصہ اوّل صفحہ ۷۶)

جنابِ والا! وقت کی کمی کے سبب ان مسائل پر سیر حاصل بحث نہ ہو سکی۔ اگرچہ حقیقتِ حال کی وضاحت کیلئے ایک دلیل ہی کافی ہے۔ مگر اہلِ علم و دانش کی تشنگی کیلئے فتاویٰ رضویہ کا مکمل سیٹ اور یٰسین اختر مصباحی صاحب کی کتاب امام احمد رضا اور ردِّ بدعات و منکرات پیش کروں گا۔

وکیلِ استغاثہ: وکیلِ صفائی کو ابھی آخری اعتراض کا بھی جواب دینا ہے۔

وکیلِ صفائی: جی ہاں! وکیلِ استغاثہ کے الزامات میں سے آخری الزام یا مولانا احمد رضا کی بلند و بالا شخصیت پر کھینچی ہوئی کمان سے چھوڑا ہوا حسد و کینہ کا پست تیر۔۔۔ کہ طوافِ قبر سے متعلق مولانا احمد رضا کا موقف کیا ہے؟

جنابِ والا! مولانا کا موقف میں بیان کیے دیتا ہوں اور اگر وکیلِ استغاثہ نے اس مسئلے کو اپنے بزرگ و پیشوا اشرف علی تھانوی صاحب کی کتاب میں پڑھ لیا ہوتا تو اس الزام کی جرأت نہ کرتے۔

مولانا احمد رضا فرماتے ہیں، بلاشبہ غیر کعبہ معظمہ کا طوافِ تعظیمی ناجائز ہے اور غیر خدا کو سجدہ ہماری شریعت میں حرام ہے۔ (احکام شریعت حصہ سوم صفحہ ۳)

وکیلِ استغاثہ کے علم میں اضافے کیلئے اشرف علی تھانوی صاحب کا یہ اقتباس بھی سناتا چلوں۔ حصولِ برکت کیلئے مزار کے گرد پھرنا تو وہابیوں اور دیوبندیوں کے یہاں بھی جائز ہے۔ اشرف علی تھانوی، شاہ ولی اللہ کے حوالے سے لکھتے ہیں، مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کا ارشاد سو اس میں کچھ حجت نہیں کیونکہ یہ طواف اصطلاحی نہیں ہے جو تعظیم و تقرب کیلئے کیا جاتا ہے اور جس کی ممانعت نصوصِ شرعیہ سے ثابت ہے بلکہ طواف لغوی ہے۔ یعنی محض اسکے گرد پھرنا واسطے پیدا کرنے مناسبت روحی کے صاحبِ قبر کیساتھ اور لینے فیوض کے بلا قصد تعظیم و تقرب کے اور وہ بھی عوام کیلئے نہیں، جن کو فرق و مراتب کی تمیز نہیں بلکہ اہلسنت کیلئے جو جامع ہوں درمیانِ شریعت و طریقت۔ (حفظ الایمان، ص ٦)

جج: دلائل و براہین کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ مولانا احمد رضا نے باطل رسم و رواج کو نہ صرف ختم کرنے کیلئے جہاد کیا بلکہ آپ نے بدعات کو مٹانے میں بھی ایک بہت واضح کردار ادا کیا جیسا کہ ان کی کتب سے بھی ظاہر ہے۔

عدالت برخواست ہوتی ہے۔

تیسرا مقدمہ

وکیلِ استغاثہ: جناب والا آج کی اس عدالت کو یقیناً اس بات کی حقیقت سے کوئی انکار نہ ہو گا کہ مولانا احمد رضا، بریلوی فرقے کے امام اور مسلمانوں کو وہابی، دیوبندی اور بریلوی میں تقسیم کرنے والے ایک مذہبی اسکالر تھے۔ اور بریلی وہ شہر تھا جہاں انہوں نے کفر کی مشین لگائی ہوئی تھی، جب چاہتے اور جسے چاہتے کافر بنادیتے تھے۔ وہ اتحاد بین المسلمین کے مخالف تھے۔

وکیلِ صفائی: جنابِ والا! آج کی اس عدالت میں، مَیں وکیلِ استغاثہ کے طرزِ بیان اور اندازِ تکلم پر احتجاج کرتے ہوئے کہنا چاہوں گا کہ اہلِ عقل ودانش کی عدالت میں وکیلِ استغاثہ تہذیب وشرافت کے دامن کو نہ چھوڑا کریں (حالانکہ انہوں نے کبھی پکڑا نہیں) اور عدالت میں مقدمے سے قبل ہی انہوں نے عدالت کے معزز ججوں کو لفظوں (اس عدالت کو یقیناً اس بات کی حقیقت سے کوئی انکار نہ ہو گا) سے خریدنے کی جو سنگین خطا کی ہے وہ توہینِ عدالت کے زمرے میں آتی ہے۔

وکیلِ استغاثہ: آج کا مقدمہ اتنا آسان نہیں جتنا وکیلِ صفائی سمجھ رہے ہیں۔ آج وکیلِ صفائی لفظوں کے دریا اور جملوں کی شوخیاں بہا کر حقیقت کی اس شمع کو گل نہ کر سکیں گے۔

وکیلِ صفائی: آج وکیلِ استغاثہ کے غرور کو دیکھ کر شیطان بھی سہم گیا ہو گا۔ اگر حقیقتاً ایسا ہی ہے تو دماغ کی میان سے دلائل کی تلوار نکال کر میدانِ عمل میں کود پڑیں اور اگر پچھلے دو مقدموں کا حشر یاد ہے تو مَیں انہیں مشورہ دوں گا کہ وہ اس سے گریز کریں۔

وکیلِ استغاثہ: وکیلِ صفائی تو دلائل کے حملوں سے قبل ہی گھبرا گئے۔

وکیلِ صفائی: اگر وکیلِ استغاثہ تکبر کی شراب پی کر اتنے مدہوش ہو چکے ہیں کہ انہیں پچھلے دو مقدموں کا حشر یاد نہیں تو وقت ضائع کئے بغیر دلائل اس عدالت کے سامنے پیش کرنا شروع کریں۔

وکیل استغاثہ: جناب جج صاحب! آج دلیل نہیں دلائل ہیں، آج حوالہ نہیں حوالہ جات ہیں۔ آج مقدمے میں لفظوں کی جنگ نہیں، حقیقت کا رنگ ہے۔

جنابِ والا: آج اگر مولانا احمد رضا کو فرقہ واریت کا نقیب کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ محترم جج صاحب! ڈاکٹر خالد محمود صاحب جو کہ ایک مایہ ناز اسکالر ہیں، وہ اپنی کتاب مطالعہ بریلویت میں مولانا احمد رضا کی نقاب کشائی کرتے ہوئے وصایا شریف کے حوالے سے لکھتے ہیں، بانس بریلی ہندستان کے ایک صوبہ یوپی کا ایک شہر ہے جہاں مولانا احمد رضا خاں پیدا ہوئے، انہوں نے ایک مذہب ترتیب دیا اور اپنے پیرووں کو اس پر چلنے کی وصیت کی۔ میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے اس پر مضبوطی سے قائم رہنا، ہر فرض سے اہم فرض ہے، اللہ توفیق دے۔ (مطالعہ بریلویت، صفحہ ۹۱ مطبوعہ دار المعارف لاہور ۱۹۶۸ء)

مزید آگے لکھتے ہیں، جس شخص نے ایک نیا مذہب بنا رکھا ہو اور لوگوں کو برملا کہے میرے دین و مذہب پر قائم رہنا، ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ (مطالعہ بریلویت، ص ۷۲)

اس روشن مثال کے بعد کیا کسی دلیل کی حاجت رہ جاتی ہے کہ مولانا نے اسلام کو فرقہ واریت کی تلوار سے پارہ پارہ کر ڈالا اور ایک نئے دین جو ان کی کتب سے ظاہر ہے کی پیروی کی وصیت کی۔

وکیل صفائی: جب اہلِ علم، علم و دانش کی عدالتوں میں علمی خیانت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں اور حقایق کی شکل مسخ کرنے کا مقدس فریضہ انجام دینے لگیں تو ان کیلئے یہی کہا جاسکتا ہے۔

وکیل صفائی: وکیلِ استغاثہ نے ڈاکٹر خالد محمود کا وصایا شریف کے حوالے سے جو اقتباس نقل کیا ہے، وہ ادھورا اور سیاق و سباق سے ہٹ کر ہے۔ اصل عبارت یوں ہے، حتی الامکان اتباعِ شریعت نہ چھوڑو اور میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے اس پر مضبوطی سے قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔

عقل و دانش کی اس عدالت میں تشریف فرما ہونے والے بزرگو! اعلیٰ حضرت نے تو 'میرا دین و مذہب' سے پہلے ہی یہ فرمایا کہ حتیٰ الامکان اتباعِ شریعت نہ چھوڑو۔

اگرچہ اس جملے سے وضاحت ہو جاتی ہے، لیکن مَیں مثال دے کر بات آگے بڑھاتا ہوں۔

جنابِ والا! قبر میں فرشتے یہ سوال کرتے ہیں مَا دِیْنُكَ تیرا دین کیا ہے؟ تو مسلمان جواب دے گا 'میرا دین اسلام ہے' مولانا احمد رضا نے بھی تو یہی فرمایا، 'حتی الامکان اتباعِ شریعت کو نہ چھوڑنا اور میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے اس پر مضبوطی سے قائم رہنا، ہر فرض سے اہم فرض ہے'۔

مولانا احمد رضا کی کتب میں یہی تو ہے کہ ہر گمراہی اور الحاد سے دور رہو اور بے دین گمراہوں سے دور بھاگو۔ اسی وصایا شریف میں ہے، تم مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بھولی بھالی بھیڑیں ہو، بھیڑیئے تمہارے چاروں طرف ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں بہکادیں، تمہیں فتنہ میں ڈال دیں، تمہیں اپنے ساتھ جہنم میں لے جائیں۔ ان سے بچو اور دور بھاگو، دیوبندی ہوئے، رافضی ہوئے، نیچری ہوئے، قادیانی ہوئے، چکڑالوی ہوئے۔ غرض کتنے ہی فرقے ہوئے اور اب سب سے نئے گاندھوی ہوئے، جنہوں نے ان سب کو اپنے اندر لے لیا۔ یہ سب بھیڑیئے ہیں، تمہارے ایمان کی تاک میں ہیں۔ ان کے حملوں سے اپنے ایمان بچاؤ۔ (وصایا شریف، ص ۱۸۔ مطبوعہ مکتبہ اشرفیہ)

مزید مولانا احمد رضا اپنے اسلاف اہلسنت وجماعت کی طرح عشق رسول اور محبتِ مصطفیٰ کا درس یوں دیتے نظر آتے ہیں، 'اللہ عزوجل ورسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سچی محبت اور ان کی تعظیم اور ان کے دوستوں کی خدمت اور ان کی تکریم اور ان کے دشمنوں سے سچی عداوت۔ جس سے اللہ عزوجل ورسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں ادنیٰ توہین پاؤ۔ پھر وہ کیسا ہی پیارا کیوں نہ ہو فوراً اس سے جدا ہو جاؤ جس کو بارگاہِ رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں ذرا بھی گستاخ دیکھو پھر وہ تمہارا کیسا ہی بزرگ معظم کیوں نہ ہو اپنے اندر سے اسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دو۔ (وصایا شریف، صفحہ ۱۸، ۱۹)

محترم جج صاحب! یہ عبارت بتارہی ہے کہ عاشق رسولِ محب مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایسے ہی ہوا کرتے ہیں اور ایسے ہی مومنوں اور عاشقوں کیلئے قرآن یوں ارشاد فرماتا ہے:

لا تجد قوما یؤمنون باللہ و الیوم الاٰخر یوآدون من حآد اللہ و رسولہٗ و لو کانوا اٰبآءھم او ابنآءھم

او اخوانھم او عشیرتھم اولٰٓئک کتب فی قلوبھم الایمان و ایدھم بروح منہ (سورہ مجادلہ، آیت ۲۲)

یعنی تم نہ پاؤ گے ان لوگوں کو جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ان سے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے مخالفت کی اگرچہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبے والے ہوں، یہ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان نقش فرمایا اور اپنے طرف کی روح سے مدد کی۔

وصایا شریف کا مضمون قرآن کریم کے عین مطابق ہے مجھے یقین ہے کہ وکیلِ استغاثہ مطمئن ہوگئے ہوں گے۔ لیکن وکیلِ استغاثہ اور ان کے یار غار ڈاکٹر خالد محمود کیلئے میں مزید دلائل دینے کی اجازت چاہتا ہوں۔

جج: اجازت ہے۔

وکیلِ صفائی: جنابِ والا! ابھی تک تو ہم نے حقیقتِ حال سے پردہ اُٹھایا تھا لیکن اب ہم اس الزام وبہتان تراشی کی حقیقت کا جائزہ وکیلِ استغاثہ اور ڈاکٹر خالد محمود کے اکابرین کی کتب سے لیں گے۔ اس سے قبل کہ مَیں اکابرینِ دیوبند کی کتب سے اس الزام کے ردّ میں حوالے پیش کروں۔ایک ایسا حوالہ پیش کرنا چاہوں گا کہ جس کا جواب وکیلِ استغاثہ اور ڈاکٹر خالد محمود پر اُدھار رہے گا۔

وکیلِ استغاثہ کے اکابر مولانا رشید احمد گنگوہی نے بارہا یہ کہا، اور بقسم کہتا ہوں کہ مَیں کچھ نہیں ہوں مگر اس زمانے میں ہدایت ونجات موقوف ہے میرے اتباع پر۔ (تذکرۃ الرشید، جلد دوم ص ۱۷)

وکیلِ استغاثہ اس عبارت پر کیا کہیں گے۔رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع کا درس دینے کے بجائے اپنی اتباع کا حکم دے رہے ہیں اور ہدایت ونجات بھی اسی پر موقوف ہے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

محترم جج صاحب! مولانا احمد رضا کا مسلک وہی تھا جو علمائے بدایوں کا تھا، مولانا اسی فکر کی ترویج واشاعت میں مصروفِ عمل رہے جو فکر شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ کی تھی اور مسلمانوں کی راہ سے جدا راہ نہ چلے۔

سلیمان ندوی صاحب جو اہلِ حدیث مکتبِ فکر کے حامل ہیں، لکھتے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد دو گروہ نمایاں ہوئے:۔

- علمائے دیوبند اور مولانا سخاوت علی جونپوری وغیرہ، اس سلسلے میں توحیدِ خالص کے جذبہ کے ساتھ حنفیت کی تقلید کا رنگ نمایاں رہا۔
- میاں نذیر حسین، اس سلسلے میں توحید خالص اور ردّ بدعت کے ساتھ فقہ حنفی کی تقلید کے بجائے براہِ راست کتب حدیث سے بقدر فہم استفادہ اور اس کے مطابق عمل کا جذبہ نمایاں ہوا اور اسی سلسلے کا نام اہلِ حدیث مشہور ہوا۔

ان دو کے علاوہ ایک تیسرا سلسلہ بھی تھا۔ تیسرا فریق وہ تھا جو شدت کے ساتھ اپنی روش پر قائم رہا اور اپنے آپ کو اہل السنۃ کہتا رہا، اس گروہ کے پیشوا زیادہ تر بریلی اور بدایوں کے علماء تھے۔ (حیاتِ شبلی، ص ۴۴/۴۶ کا انتخاب)

سلیمان ندوی صاحب کے اس بیان سے روزِ روشن کی طرح یہ بات عیاں ہوگئی کہ مولانا احمد رضا قدیم مذہب اہلسنت و جماعت کے پیروکار تھے۔ جبکہ وکیلِ استغاثہ اور ڈاکٹر خالد محمود جس مذہب کے پیروکار ہیں وہ نیا مذہب ہے اور ان کے اکابر مسلمانوں میں فرقہ واریت کے بیج کی نمو کرنے والے ہیں۔

وکیلِ استغاثہ: جنابِ والا! وکیلِ صفائی ایک نئے مقدمے کی فائل کھولنا شروع کررہے ہیں۔

وکیلِ صفائی: آئینہ اُن کو دکھایا تو بُرا مان گئے۔ جنابِ والا! میں نہ نئے مقدمے کی فائل کھول رہا ہوں اور نہ ہی کسی پر کیچڑ اُچھال رہا ہوں، بلکہ حقیقت کی حقیقی معنوں میں تصویر دکھا رہا ہوں۔

مسلکِ اہلِ حدیث کے نمائندہ اور بڑے عالمِ دین ثناء اللہ صاحب امرتسری نے ۱۹۳۷ء میں اپنی کتاب 'شمع توحید' میں اسی حقیقت کو یوں نقل کیا ہے، امرتسر میں مسلم آبادی غیر مسلم آبادی (ہندو، سکھ وغیرہ) کے مساوی ہے اسّی سال قبل پہلے سب مسلمان اسی خیال کے تھے جن کو بریلوی حنفی خیال کیا جاتا ہے۔ (شمع توحید، ص ۴۰)

اور مشہور مورخ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں، انہوں (مولانا احمد رضا) نے نہایت شدّت سے قدیم حنفی طریقوں کی حمایت کی۔ (موجِ کوثر، ص ۷۰ طبع ہفتم ۱۹۳۰ء)

ان دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ امام احمد رضا اسی مسلک کے پیروکار تھے جو شاہ عبدالحق محدث دہلوی کا تھا، جو خواجہ غریب نواز کا تھا، جو سلف صالحین کا تھا۔ مولانا احمد رضا خاں اتحاد بین المسلمین کے داعی تھے۔

وکیلِ استغاثہ: وکیلِ صفائی کے ذہن پر اگر گراں نہ گزرے اور وہ پریشان نہ ہوں تو اس عدالت میں مولانا کے کفر کے فتووں کی حقیقت کو بھی آشکار کریں۔ اور اس عدالت کو بتائیں کہ کیا مولانا احمد رضا نے علمائے دیوبند کو کافر قرار نہیں دیا۔ کیا اتحاد بین المسلمین کے داعی کا کردار ایسا ہی ہوتا ہے؟

وکیلِ صفائی: وکیلِ استغاثہ کے اعتراض سے قبل میں یہ ثابت کرچکا کہ مولانا احمد رضا نے کسی نئے مسلک کی بنیاد ہرگز ہرگز نہیں رکھی بلکہ ہمیشہ مذہبِ اہلسنّت وجماعت کے داعی رہے لیکن وکیلِ استغاثہ نے دوسرا سوال یہ چھیڑ دیا کہ کفر کے فتوے دیئے، اس سے قبل کہ اس پر بحث کروں، میں اس عدالت سے درخواست کروں گا کہ دیوبند کی تاریخ بیان کرنے کی اجازت دی جائے۔

جج: اجازت ہے۔

وکیلِ صفائی: جنابِ والا! دارالعلوم دیوبند کے استاذالحدیث مولانا انظر شاہ کشمیری ابن مولانا انور شاہ کشمیری رقم طراز ہیں، میرے نزدیک دیوبندیت خالص ولی اللّٰہی فکر بھی نہیں اور نہ کسی خانوادہ کی لگی بندھی فکر دولت ومتاع ہے۔ میرا یقین ہے کہ اکابرِ دیوبند جن کی ابتدا میرے خیال میں سیدنا الامام مولانا قاسم صاحب اور فقیہ اکبر مولانا رشید احمد گنگوہی سے ہے۔ دیوبندیت کی ابتداء حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کرنے کے بجائے مذکورہ بالا دو عظیم انسانوں سے کرتا ہوں۔ (ماہنامہ البلاغ۔ مارچ ۱۹۶۹ء ص ۴۸)

جنابِ والا! وکیلِ استغاثہ کے گھر کی شہادت سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ دیوبندی مذہب بالکل نیا مذہب ہے، جس کے بانی قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی تھے۔ یہی وہ فرقہ ہے جو اہلسنت کی راہ سے جدا راہ چلا۔

جج! عدالت کا وقت ختم ہوا جاتا ہے اس پر آئندہ تاریخ پر بحث کی جائے گی۔

دوسرا سیشن

وکیلِ استغاثہ: جنابِ والا! کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان کیلئے کافر کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں، لیکن مولانا احمد رضا نے نہ صرف اپنے مسلک کے سوا ہر مسلک کو کافر اور خصوصاً مسلکِ دیوبند اور وہابیت کے اکابرین پر کفر کے فتوؤں کے گولے داغے۔ اگر مولانا دوسروں کو برداشت کر لیتے تو آج ملتِ اسلامیہ یوں ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہوتی اور فرقہ واریت کا عفریت یوں دنگل نہ مچاتا۔

وکیلِ صفائی: جناب والا! وکیلِ استغاثہ کے اس استغاثہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وکیلِ استغاثہ مولانا احمد رضا پر صرف الزام ہی نہیں لگا رہے ہے بلکہ فردِ جرم بھی عائد کر رہے ہیں۔ آج کی اس عدالت میں، مَیں چند ایک تاریخی واقعات پیش کروں گا۔

محترم جج صاحب! مٹی، سیمنٹ، بجری وغیرہ کا ملاپ عمارت کی تشکیل دیتا ہے لیکن یہ عمارت، یہ مٹی نہ تو معتبر ہوتی ہے اور نہ مقدس لیکن اگر یہی عمارت مسجد کی شکل اختیار کر لے تو انتہائی مقدس ہو جاتی ہے، خانہ خدا قرار پاتی ہے۔ انسان ادب و احترام کے تمام قوانین بجالاتا ہے اور توحید کے ڈنکے بجانے لگتا ہے۔

لیکن جناب والا! تاریخ کے صفحات کو اُلٹ دیجیے، آپ دیکھیں گے اللہ کا نام لیکر بنائی جانے والی مسجد کو، توحید کے (نام نہاد) ڈنکے بجانے والی عمارت کو ڈھایا گیا۔ واقعہ ہے عہد نبوی کا اور اس عمارت کا نام ہے مسجد ضرار مگر اس عمارت کو ڈھایا گیا۔

ایک انجان آدمی یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ کیا اس عمارت میں لات و ہبل کی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں؟

کیا اس مسجدِ ضرار میں خدا کے بجائے بتوں کی عبادت ہوتی تھی؟

کیا یہاں پر نماز کے بجائے لات و ہبل کی پوجا ہو رہی تھی؟

تو تاریخ جواب دیتی ہے۔ نہیں، ایسا نہیں تھا۔

تو پھر اس مسجد کو ڈھا کیوں دیا گیا؟ اس عمارت کے تقدس میں شبہ کیا تھا، یہ بھی اسی مٹی سے تشکیل دی گئی تھی جس مٹی سے دیگر مساجد معرضِ وجود میں آئیں۔

تو تاریخ جواب دیتی ہے کہ یہ سچ ہے کہ اس کی تعمیر اسی مٹی سے ہوئی تھی جس مٹی سے اور دیگر مساجد کی تعمیر ہوئیں۔ مگر یہاں وہ خلوص نہیں تھا جو مسجد کی تعمیر میں ہوتا بلکہ یہ مسجد کے نام پر اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی منافقین کی وہ سازش تھی

جس کو اللہ کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ڈھانے کا حکم دیا۔ یہ مسجد کے نام پر مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کا وہ مرکز تھا جہاں سے افتراق وانتشار کے طوفان اُٹھنے والے تھے۔ لہٰذا اس مسجد کو ڈھانے کا حکم دیا گیا۔ اور اس کی جگہ کو کوڑے کا ڈھیر بنا دیا گیا اور اسے قرآن نے یوں بیان کیا:۔

والذین اتخذوا مسجدا ضرارا و کفرا و تفریقا بین المؤمنین و ارصادا لمن حارب اللہ و رسولہ من قبل و لیحلفن ان اردنآ الا الحسنٰی واللہ یشھد انھم لکٰذبون لا تقم فیہ ابدا (پارہ ۱۱۔ سورہ توبہ۔ آیت ۱۰۷)

اور وہ لوگ جنہوں نے ایک مسجد بنائی تا کہ مسلمانوں کو ضرر پہنچائیں اور وہاں سے کفر پھیلائیں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالیں اور اس شخص کے واسطے اسے کمین گاہ بنائیں جو پہلے سے خدا اور رسول سے لڑ رہا ہے وہ قسم کھا کر یقین دلائیں گے کہ مسجد کی تعمیر سے ان کا مقصد سوائے بھلائی اور کچھ نہیں ہے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں آپ ہر گز ان کی مسجد میں نہ جائیں۔

جنابِ والا! بالکل اسی طرح انسان بھی مٹی سے تخلیق ہوا اور یہی مٹی علم و فضل کے وصف سے متصف ہو جاتی ہے تو علامہ، حکیم الامت، عالمِ دین، شیخ الحدیث، مفسر قرآن جیسے مقدس القاب سے ملقب ہو جاتی ہے پھر ان کی تعظیم و تکریم کی جاتی ہے بسبب نائبِ رسول، بسبب علم و فضل، بسبب مفسر قرآن، بسبب شیخ الحدیث۔

لیکن جب یہی حاملین دین وایمان، محراب و منبر کے تقدس کو پامال کرنے لگیں، علم و فضل کی مسندوں پر بیٹھ کر مسلمانوں کے نظریات کو کچلنے لگیں، تو عالمِ دین نہیں علمائے سوء قرار پاتے ہیں اور پھر ان کو ڈھانے کیلئے کہیں شیر خدا کسی خارجی کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرتے ہیں، تو کہیں حسین ابن علی کربلا کے میدان میں یزیدیت کو فاش شکست دیتے ہوئے پیام اجل کو لبیک کہتے ہیں تو کہیں برصغیر کے میدان میں شیخ سرہندی، اکبر کے درباری علما کے خلاف علمی و عملی جہاد کرتے نظر آتے ہیں۔

اور جب یہی مٹی کے تودے علم و فضل کی قباؤں اور عماموں کو پیچ در پیچ لپیٹے انگریزوں کے وفادار، ملتِ اسلامیہ کے نظریات پر شب خون مارتے نظر آتے ہیں تو مولانا احمد رضا، علمائے حرمین شریفین کی حمایت کے ساتھ ان مٹی کے تودوں کو جو علم و فضل کی قبائیں پہنے ہیں، ڈھاتے نظر آتے ہیں۔

وکیلِ استغاثہ: بہت خوب، مَیں وکیلِ صفائی کو اس شاندار تقریر پر داد دیتا ہوں۔ اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ وکیلِ صفائی نے اپنی طویل تقریر میں کہا تو سارے دیوبندی مکتب فکر کو کفر کی مشین تلے کیوں پیس دیا گیا؟ سارے مسلک کو کافر کیوں قرار دیا گیا؟

وکیلِ صفائی: جناب والا! وکیلِ استغاثہ نے ابھی جو کچھ کہا وہ جنون میں عقل کا جنازہ تو کہا جا سکتا ہے مگر سچائی کا تقاضا نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو وکیلِ استغاثہ بتائیں کہ کب اور کہاں مولانا نے پوری ملتِ دیوبندیہ کو کافر کہا ہے؟ مولانا نے کب اور کہاں سارے مسلک کے لوگوں کو کافر قرار دیا؟

جنابِ والا! وکیلِ استغاثہ ہی بتائیں کہ کیا گستاخِ رسول کافر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کو مسلمان جاننے والا کون ہو گا؟ یہ قانون نہ تو مولانا احمد رضا نے ایجاد کیا ہے اور نہ ہی یہ اُن کی اختراع ہے۔ یہ اصول و قواعد تو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دیئے اور سلف صالحین نے قرناً بعد قرن اور نسلاً بعد نسلٍ دار و رسن کے پھندوں کو چومتے ہوئے ہم تک پہنچائے۔ مولانا احمد رضا خاں کفر کا فتویٰ لگانے میں مسلمان سلف صالحین کی طرح نہایت محتاط تھے۔

وکیلِ استغاثہ: مجھے وکیلِ صفائی کے اس بیان پر کہ مولانا احمد رضا کفر کے فتویٰ لگانے میں بہت محتاط تھے، اعتراض ہے۔ مَیں اپنی بات نہیں کرتا، ڈاکٹر خالد محمود لکھتے ہیں، مولانا احمد رضا خاں مسلمانوں کی تکفیر میں واقعی بہت جری تھے۔ وہابی اور دیوبندی تو ایک طرف رہے، جو شخص ان میں سے نہ ہو لیکن انہیں کافر بھی نہ سمجھتا ہو مولانا احمد رضا خاں اسے بھی معاف نہیں کرتے۔ جو شخص ان حضرات کے کفر میں شک بھی رکھتا ہو اس کے بارے میں مولانا احمد رضا خاں کا فتویٰ درج ذیل ہے، اس فتویٰ میں تکفیر کے بجائے تفریق کا پہلو زیادہ غالب نظر آرہا ہے۔ یہ انداز مولانا احمد رضا خاں کے مقصد درونِ خانہ کا پتہ دیتا ہے۔ ہندستان میں انگریز حکومت یہ چاہتی تھی کہ مسلمان کہیں اکھٹے نہ بیٹھ سکیں۔ تکفیر اسی منزلِ تفریق کا ایک زینہ ہے۔ (مطالعہ بریلویت، ص ۹۷)

وکیلِ صفائی: جس طرح انگوروں کو سڑا کر اُم الخبائث تیار کی جاتی ہے اور اس سے بو آتی ہے۔ اسی طرح جب دماغ کی ہانڈی میں کتابی علم، بغض و حسد کی آتش میں پکنے لگتا ہے تو اس سے بھی ایسا ہی تعفن اُٹھتا ہے، جیسا کہ خالد محمود کی مذکورہ بالا عبارت سے اُٹھ رہا ہے۔

بجائے اس کے کہ ڈاکٹر خالد محمود مسلمانوں کو جوڑنے کیلئے اتحاد بین المسلمین کی حمایت میں کوئی کتاب رقم کرتے، انہوں نے انتشار کی آتش برپا کرنے کیلئے دیانت کا خون اور علمی خیانت کی علم برداری کرتے ہوئے 'مطالعہ بریلویت' لکھ ڈالی۔ اندازوں اور تخمینوں کی بنیاد پر الزام تراشیوں کا دیوان ترتیب دے کر اپنا نامہ اعمال سیاہ کر ڈالا۔

جنابِ والا! وکیلِ استغاثہ کے معاون و مددگار جناب ڈاکٹر خالد محمود صاحب کی عبارت پر مَیں کیا تبصرہ کروں' ڈاکٹر خالد محمود ہی کے گھر سے اس عدالت کو دلیل فراہم کر دیتا ہوں۔ جناب جج صاحب! دیوبند کے مشہور و معروف اسکالر شبیر احمد عثمانی صاحب رقم طراز ہیں، مولانا احمد رضا خاں کو تکفیر کے جرم میں بُرا کہنا بہت ہی برا ہے کیونکہ وہ بہت ہی بڑے عالم دین اور بلند پایا محقق تھے۔ مولانا احمد رضا خاں کی رحلت عالم اسلام کا ایک بہت بڑا سانحہ ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ (ہادی دیوبند، ص ۲۱۔ ذوالحجہ ۱۳۶۹ھ)

جنابِ جج صاحب! مولانا احمد رضا خاں نے اپنی زندگی میں صرف پانچ افراد پر لگے ہوئے کفر کے فتوے کی تصدیق کی اور حقیقتاً وہ فتویٰ مولانا احمد رضا خاں کا نہیں علمائے حرمین شریفین کا تھا۔ مولانا احمد رضا اس قدر محتاط تھے کہ انہوں نے پہلے (علمائے دیوبند کی گستاخانہ عبارتوں پر) حرمین شریفین کے مفتیانِ کرام سے فتوے منگوائے، پھر اس کی تصدیق فرمائی۔

وہ گستاخانہ عبارتیں کیا تھیں؟ مَیں دل پر پتھر رکھ کر چند ایک نقل کر دیتا ہوں۔ چاول کے چند دانے دیکھ کر دیگ کا اندازہ لگانا، اہلِ عقل کیلئے کچھ بھی مشکل نہ ہو گا۔

رشید احمد گنگوہی نے انگریز کی ایما پر کس طرح اسلامی نظریات پر شب خون مارا، اس کی صرف ایک ہی مثال کافی ہے۔ لکھتے ہیں، شیطان وملک الموت کا حال دیکھ کر عالم محیط زمین کا فخر عالم کو خلافِ نصوصِ قطعیہ کے بلا دلیل محض قیاسِ فاسدہ سے ثابت کرنا شرک نہیں تو کون سا ایمان کا حصہ ہے۔ شیطان وملک الموت کو یہ وسعت نص سے ثابت ہوئی فخر عالم (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے وسعتِ علم کی کون سی نص قطعی ہے کہ جس سے تمام نصوص رد کر کے ایک شرک ثابت کرتا ہے۔ (براہین قاطعہ، صفحہ ۵۱)

اشرف علی تھانوی صاحب رقم طراز ہیں، پھر یہ کہ آپ کی ذاتِ مقدسہ پر علمِ غیب کا حکم کیا جانا اگر بقول زید صحیح ہو تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس غیب سے مراد بعض غیب ہیں یا کُل غیب، اگر بعض علوم غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور ہی کی کیا تخصیص ہے، ایسا علمِ غیب تو زید وعمر بلکہ ہر صبی ومجنون بلکہ جمیع حیوانات وبہائم کیلئے بھی حاصل ہے۔ (حفظ الایمان، ص ۷)

جنابِ والا! مولانا احمد رضا خاں نے پانچ افراد کی تکفیر فرمائی جس پر پاک وہند اور حرمین شریفین کے علماء کی تصدیق بھی موجود ہیں اور وہ 'الصورام الہندیہ' اور 'حسام الحرمین' کے نام سے موسوم ہیں۔ اور ان پانچ افراد کے نام درج ذیل ہیں:۔

(۱) مرزا غلام احمد قادیانی (۲) رشید احمد گنگوہی (۳) قاسم نانوتوی (۴) خلیل احمد انبیٹھوی (۵) اشرف علی تھانوی

جنابِ جج صاحب! یہ تصدیقات وکیلِ استغاثہ کے چھوٹے سے ذہن میں سما نہ سکیں گی، لہٰذا میں ان کو اُن کے گھر سے ایک اور دلیل فراہم کر دیتا ہوں۔

دار العلوم دیوبند کے مشہور عالم مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، مولانا احمد رضا خاں صاحب کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں، اگر خاں صاحب کے نزدیک بعض علمائے دیوبند واقعی ایسے ہی تھے جیسا کہ انہوں نے سمجھا تو خاں صاحب پر ان علمائے دیوبند کی تکفیر فرض تھی، اگر وہ ان کو کافر نہ کہتے، تو خود کافر ہو جاتے۔ (اشد العذاب، ص ۱۳۔ مطبوعہ دار العلوم دیوبند)

جناب والا! اگر علمائے دیوبند کی وہ عبارتیں جن پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا، کفریہ نہ ہوتیں تو مرتضیٰ حسن صاحب یوں تحریر نہ فرماتے بلکہ یوں لکھتے۔ اگر خاں صاحب کے نزدیک بعض علمائے دیوبند ایسے ہی تھے جیسا کہ انہوں نے سمجھا اور وہ ایسے نہ تھے بلکہ واقعی مسلمان تھے تو مسلمان کی تکفیر کر کے وہ خود کافر ہو گئے۔ لیکن مرتضیٰ حسن صاحب نے ایسا نہیں لکھا۔ بلکہ یہ لکھا کہ 'خان صاحب پر علمائے دیوبند کی تکفیر فرض تھی اگر وہ ان کو کافر نہ کہتے تو خود کافر ہو جاتے'۔

وکیل استغاثہ 'المہند' کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں، ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ نبی کریم علیہ السلام کا علم، حکم و اسرار وغیرہ کے متعلق مطلقاً تمامی مخلوقات سے زیادہ ہے اور ہمارا یقین ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ فلاں شخص نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اعلم ہے وہ کافر ہے۔ اور ہمارے حضرات اس شخص کے کافر ہونے کا فتویٰ دے چکے ہیں جو یوں کہے کہ شیطان ملعون کا علم نبی کریم علیہ السلام سے زیادہ ہے، پھر بھلا ہماری کسی تصنیف میں یہ مسئلہ کیا پایا جا سکتا ہے۔ (المہند، ص ۲۵،۲۶۔ از خلیل احمد انبیٹھوی)

اور 'براہین قاطعہ' میں یہی خلیل احمد لکھتے ہیں، الحاصل غور کرنا چاہیے کہ شیطان ملک الموت کا یہ حال دیکھ کر عالمِ محیط زمین کا فخرِ عالم کو خلافِ نصوصِ قطعیہ کے بلا دلیل محض قیاسِ فاسدہ سے ثابت کرنا شرک نہیں تو کون سا ایمان کا حصہ ہے۔ شیطان و ملک الموت کو یہ وسعت نص سے ثابت ہوئی، فخرِ عالم کی وسعتِ علم کی کونسی نص قطعی ہے کہ جس سے تمام نصوص کو رد کر کے ایک شرک ثابت کرتا ہے۔ (براہین قاطعہ، ص ۵۱۔ از خلیل احمد انبیٹھوی)

مذکورہ بالا دونوں عبارتیں عدالت کے معزز ججوں نے ملاحظہ کیں۔ کیا منافقین کا طرزِ عمل یہ نہیں تھا؟ تھا، بالکل یہی تھا۔ مسلمانوں کو دھوکا دینے کیلئے کچھ اور پیچھے کچھ۔

'المہند' کی مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ علمائے حرمین شریفین اور مولانا احمد رضا کا فتویٰ حق اور درست تھا۔

جناب والا! میں نے یہ ایک مثال پیش کی ہے، اسی طرح کئی مثالیں ایسی موجود ہیں۔

محترم جج صاحب! ڈاکٹر خالد محمود وہ شخصیت ہیں جن کو ملتِ اسلامیہ میں رہنے والا امن و سکون، بھائی چارہ، محبت ایک آنکھ نہیں بھاتی اور اُمت کو فرقہ واریت کی بھٹی میں جھونکنے کیلئے وہ اور ان جیسے دانا دشمن یا نادان دوست 'مطالعہ بریلویت' جیسی کتب لکھتے رہتے ہیں۔

مولانا احمد رضا خاں صاحب کے بارے میں دیوبند کے عالم سید سلیمان ندوی صاحب اس طرح اظہارِ خیال فرماتے ہیں،

اس احقر نے جناب مولانا احمد رضا خان بریلوی مرحوم کی چند ایک کتابیں دیکھیں تو میری آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ حیران تھا کہ واقعی مولانا بریلوی صاحب مرحوم کی ہیں جن کے متعلق کل تک یہ سنا تھا کہ وہ صرف اہل بدعت کے ترجمان ہیں اور صرف چند فروعی مسائل تک محدود ہیں۔ مگر آج پتہ چلا کہ نہیں ہرگز نہیں یہ اہل بدعت کے نقیب نہیں بلکہ یہ عالم اسلام کے اسکالر اور شاہ کار نظر آتے ہیں۔ جس قدر مولانا احمد رضا خاں مرحوم کی تحریروں میں گہرائی پائی جاتی ہے، اس قدر گہرائی تو میرے استاد مکرم جناب مولانا شبلی نعمانی صاحب و حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی و حضرت مولانا شیخ التفسیر علامہ شبیر احمد عثانی کی کتابوں کے اندر بھی نہیں ہے جس قدر مولانا بریلوی کی تحریروں کے اندر ہے۔

(ماہنامہ ندوہ، ص ۱۷۔ اگست ۱۹۱۳ء)

محترم جج صاحب! سید سلیمان ندوی صاحب کے استاد محترم اتحاد بین المسلمین کے داعی مولانا احمد رضا خاں صاحب کو یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں، مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی جو اپنے عقائد میں سخت ہی متشدد ہیں، مگر اس کے باوجود مولوی صاحب کا علمی شجرہ اس قدر بلند درجہ کا ہے کہ اس دور کے تمام عالمِ دین اس مولوی احمد رضا صاحب کے سامنے پر کاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے اس احقر (شبلی) نے بھی آپ کی متعدد کتابیں بھی دیکھی ہیں جس میں احکامِ شریعت اور دیگر کتابیں بھی دیکھی ہیں اور نیز یہ کہ مولانا صاحب کی زیرِ سرپرستی ایک ماہوار رسالہ 'الرضا' بریلی سے نکلتا ہے، جس کی چند قسطیں بغور وخوض دیکھی ہیں۔ جس میں بلند پایہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ (رسالہ الندوہ، ص ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء)

فرقہ واریت کے تباہ کن اثرات کی وجہ سے قوم خون کے آنسو رو رہی ہے۔ خود کش حملوں کی بہتات ہو یا بم دھماکوں کا تسلسل، مخالفین کا قتل عام ہو یا طرفین کے گرتے ہوئے علما کے لاشے، بیوہ ہوتی ہوئی قوم کی بیٹیاں، یتیم بچوں کی فوج اسلامی تہذیب و ثقافت سے عاری معاشرہ، مادیت کی کوکھ سے جنم لینے والی خود غرضی۔ یہ حالات جنگل کا نہیں بلکہ وحشیوں کا منظر نامہ پیش کر رہے ہیں اوران حالات میں اچھی کتب کے بجائے 'مطالعہ بریلویت' جیسی کتب چھاپی جارہی ہیں۔

محترم جج صاحب! آج کی اس عدالت میں، مَیں اگرچہ یہ ثابت کر چکا کہ مولانا احمد رضا اتحاد بین المسلمین کے داعی تھے اور آپ نے قوم کو ان نام نہاد علماء، حکیم الامت سے بچانے کی کوشش کی۔

سنگین مذاق کرنے والے کون تھے.... کس نے ہماری صفوں کو منتشر کیا.... کس نے ہمیں آپس میں لڑایا اور کس نے ہمارے نظریات کو تباہ و برباد کرنے کا گھناؤنا کھیل کھیلا.... کون تھا جس نے ہم کو فرقوں میں تقسیم کر کے کمزور کر ڈالا؟

جنابِ والا! اب میں ان حقائق سے پردہ اُٹھانا چاہوں گا، لیکن اس عدالت میں ایک مرتبہ پھر یہ بتاتا چلوں کہ یہ فرقہ واریت، دیوبندیت اور وہابیت مولانا احمد رضا خاں کی پیدائش سے پہلے کی ہیں، جو منظر عام پر تو بعد میں آئیں مگر پنپ پہلے ہی رہی تھیں۔ اور ملتِ اسلامیہ کے سانپوں کو انگریز بہت پہلے سے دودھ پلا رہے تھے، جسے ہم پہلے مقدمے میں ثابت کر چکے کہ کون انگریزوں کا وفادار تھا اور کس کو انگریز حکومت ۶۰۰ روپے ماہوار اس زمانے میں دیا کرتی تھی۔

انظر شاہ کشمیری لکھتے ہیں۔ اس حوالے کو مَیں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں، میرے نزدیک دیوبندیت خالص ولی اللٰہی فکر بھی نہیں اور نہ کسی خانوادہ کی لگی بندھی فکر دولت و متاع ہے۔ میرا یقین ہے کہ اکابرِ دیوبند جن کی ابتدا میرے خیال میں سیدنا الامام مولانا قاسم صاحب اور فقیہ اکبر مولانا رشید احمد گنگوہی سے ہے۔ دیوبندیت کی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کرنے کے بجائے مذکورہ بالا دو عظیم انسانوں سے کرتا ہوں۔ (ماہنامہ البلاغ مارچ ۱۹۶۹ء ص ۴۸)

اور دیوبندی مکتب فکر کے مولانا عبید اللہ سندھی صاحب رقم طراز ہیں، مولانا محمد اسحاق مکہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا مملوک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا عبد الغنی دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنایا، جو اس نئے پروگرام کی اشاعت کر کے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے۔ یہی جماعت جو آگے چل کر دیوبندی نظام چلاتی ہے۔ الغرض امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کو نئی نہج پر ڈالنے میں شاہ محمد اسحاق کی اس اصابتِ رائے کا نتیجہ تھا کہ بعد میں دہلی مدرسہ کے نمونے پر دیوبند میں جو درسگاہ قائم کی گئی، اس نے پچاس سال کے عرصے میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی۔ (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۳۴، ۱۳۵)

انگریز کی پالیسی پر مشتمل اصولوں پر عمل درآمد کس طرح کرایا گیا۔ مزید آگے لکھتے ہیں، مدرسہ دیوبند کی مرکزی فکر اور اس کی سیاسی مصلحت کے اصول امیر امداد اللہ اور ان کے رفقا مولانا قاسم، مولانا رشید احمد اور مولانا محمد یعقوب دیوبندی کی جماعت نے متعین کیے تھے۔ اس لئے دیوبندی پارٹی کی مرکزی جماعت میں وہ شخص شامل نہیں ہو سکتا جو یہ اصول کاملاً تسلیم نہ کرتا ہو۔

(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۱۵۰)

جنابِ والا! مسلکِ وہابیت کے پہلے دور کے حوالے سے عبید اللہ سندھی رقم طراز ہیں، حکومت موقتہ کے امیر شہید سید احمد ۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۱ء۔ اس سال اس تحریک کا پہلا دَور پورا ہوا اس دور میں حزب ولی اللہ میں ایک ایسا انسان بھی پیدا ہوا، جو نہ امیر تھا اور نہ امام۔ لیکن اپنی مبارک زندگی اور شہادت سے اپنے جدِ امجد کی تحریک کو زندہ کر گیا وہ مولانا محمد اسمٰعیل بن عبد الغنی بن ولی اللہ ہے۔ (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۹)

جناب والا! اس تحریک کے دوسرے دَور کو اگر میں دیوبندیت سے موسوم کروں، تو غلط نہ ہوگا۔

مولانا عبید اللہ سندھی میرے اس موقف کی تائید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں، اس تحریک کا دوسرا دَور امام محمد اسحاق نے ۱۸۳۱ء سے شروع کیا۔ آپ ۱۸۴۱ء تک دہلی میں رہے اور ۱۸۴۶ء تک مکہ معظمہ میں، دہلی میں ان کے نائب مولانا مملوک علی اور ان کے بعد مولانا امداد اللہ بارہ برس تک دہلی میں رہے یعنی ۱۸۵۷ء تک، اس کے بعد مکہ معظمہ چلے گئے۔ ہندستان میں پہلے نائب مولانا محمد قاسم ۱۸۷۹ء تک پھر مولانا رشید احمد ۱۹۰۵ء تک اور ان کے بعد شیخ الہند مولانا محمود الحسن ۱۸۲۰ء تک اس تحریک کے سرپرست رہے۔ اس سال تحریک مذکورہ کا دوسرا دور ختم ہوا۔ تحریک کے تیسرے دَور کو مولانا شیخ ہند نے ۱۹۲۰ء سے تھوڑا عرصہ پہلے شروع کیا۔ (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۹، ۱۰)

مزید لکھتے ہیں، جس دیوبندی جماعت کا ہم تعارف کرانا چاہتے ہیں وہ اسی جماعت کا دوسرا نام ہے، جو مولانا اسحاق کی ہجرت کے بعد اس کے متبعین نے ان کی مالی اعانت اور ان کے افکار کی اشاعت کیلئے بنائی تھی۔ (ایضاً، صفحہ ۱۳۵)

جناب والا! میں اس موضوع پر اتنا ہی کہوں گا کہ مسلمانوں میں انتشار و تفریق پیدا کرنے میں مولانا احمد رضا کا ہاتھ نہیں، بلکہ سید احمد بریلوی، اسماعیل دہلوی، محمد بن عبد الوہاب نجدی جس نے لارنس آف عربیہ کے ایماپر خلافتِ عثمانیہ کے سقوط میں اہم کردار ادا کیا۔ اور برصغیر میں اسی کی تحریک کو سید احمد بریلوی اور اسماعیل دہلوی نے پروان چڑھایا۔ اور مسلمانوں کے اتحاد میں پھوٹ ڈالنے کی کامیاب کوشش کی۔

محترم جج صاحب! اسماعیل دہلوی کا زمانہ مولانا احمد رضا سے قبل کا ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ وہابیت و دیوبندیت کی تقسیم مولانا احمد رضا نے کی، ایک دیوانے کی بڑ تو ہو سکتی ہے، مگر حقیقت نہیں۔

جج: دلائل و براہین کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ وکیلِ استغاثہ کے دلائل بے جان اور محض الزامات کا پلندہ تھے۔ دیوبندیت اور وہابیت کی ابتداء اور اس کے بانی محمد بن عبد الوہاب نجدی، اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی ہیں۔ اور مولانا احمد رضا خاں نہ صرف اتحاد بین المسلمین کے داعی بلکہ نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرنے والے ایک عظیم مجاہد اور مسلمانوں کے خیر خواہ لیڈر تھے اور یہ مولانا احمد رضا ہی تھے جنہوں الحاد و بے دینی کی سرکش موجوں کے سامنے بند باندھا اور نہ صرف ملّت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو کنارے لگایا بلکہ اس کے نظریات کی حفاظت بھی کی۔ کیونکہ جسم نظریے کا غلام ہوتا ہے۔ اگر نظریہ تباہ ہو جائے تو قوم تباہ ہو جاتی ہے اور یہی وہ زمانہ تھا جب علامہ اقبال نے اس الحاد اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی شان میں کانگریسی مولویوں کی عبارات دیکھ لی تھی اور یہ کہا تھا کہ

یہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا　　　روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو

عدالت برخواست ہوتی ہے۔